سرسید کے مذہبی عقائد و افکار

ایک مکالمہ

ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر ۱۹۴۶ء کی فائل سے

خوشتر نورانی

سرسید کے مذہبی عقائد وافکار
ایک مکالمہ

ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر ۱۹۴۶ء کی فائل سے

خوشتر نورانی

ادارۂ فکر اسلامی، دہلی

انتساب

حکیم ابوالریاض معراج الدین احمد

(ایڈیٹر: ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر)

کے نام

مشمولات

سرسید کے مذہبی عقائد وافکار: ایک مکالمہ

52——98

ان اشخاص کی فہرست جن کا ذکر حواشی میں کیا گیا

ابتدائیہ

محبّ گرامی محترم ثاقب رضا قادری (لاہور) ایک علم دوست نوجوان ہیں- اسلاف کے علمی اور تحریری سرمایے کو ڈھونڈ نکالنا، اس کے چہرے سے گرد صاف کر کے اسے سجانا سنوارنا، احباب میں تقسیم کرنا اور دنیا سے متعارف کرانا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہے- یہ مشغلہ کیا ہے، ایک احساس ہے، اپنے علمی سرمایے کے تحفظ کا، جو انھیں شب و روز حرکت و عمل پر اُکساتا رہتا ہے، جس سرمایے کو بنانے اور پھر ان کے ذریعے دین وملت کی تعمیر و توسیع میں اسلاف نے اپنی زندگی کا بیش قیمت حصہ لگا دیا-

اپنے اسی احساس کے پیش نظر موصوف نے کچھ مہینوں سے اہل سنت و جماعت کے منفرد ہفت روزہ اخبار ''الفقیہ'' امرتسر کی فائلیں تلاش کرنا شروع کی ہیں، (جو ۱۹۱۸ء سے ۱۹۵۲ء تقریباً ۳۵ ر برسوں تک مسلسل اہل سنت و جماعت کی تنظیمی، تحریکی اور دینی سرگرمیوں کی اشاعت کا مؤثر اور مقبول پلیٹ فارم رہا) تاکہ اپنی تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کا سراغ مل سکے اور اسلاف کی خدمات اور ان کے کارناموں کی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے، اس طرح ہم اپنے روشن ماضی سے متعارف ہو سکیں-

اپنے اس کام کے دوران کچھ دنوں قبل ثاقب رضا صاحب نے اپنی عادت کے مطابق ''الفقیہ'' ۱۹۴۶ء کی کچھ فائلیں مجھے اسکین کر کے بھیج دیں- صحافت اور تاریخ سے مجھے فطری دلچسپی رہی ہے، اس کے علاوہ جد محترم علامہ ارشدالقادری نے کبھی اپنے ایک انٹرویو میں ذکر کیا تھا کہ وہ اپنے ابتدائی دور میں اس اخبار میں مضامین لکھا کرتے تھے- یہ بات میرے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ تھی- ان وجوہات کی بنا پر میں ''الفقیہ'' کی فائلوں

کی ورق گردانی کرنے لگا- بالآخر ایک مضمون پر نظر پڑی، جس کے عنوان کے نیچے مضمون نگار کا نام اس طرح درج تھا: ''مولوی ارشد قادری بلیاوی، مدرسہ مصباح العلوم قصبہ مبارک پور-'' یہ سرسید احمد خاں کے مذہبی عقائد وافکار سے متعلق ایک جوابی مضمون تھا- اب میں ان دستیاب فائلوں کو مزید توجہ سے دیکھنے لگا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ مضمون اس بحث یا مکالمے کا حصہ ہے، جو''الفقیہ'' ۱۹۴۶ء کے شماروں میں سرسید کے مذہبی معتقدات پر ہوا تھا، جس میں کئی سرکردہ علما اور قارئین نے حصہ لیا تھا- اس اجمال کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

بیسویں صدی کا نصف اول سیاسی اعتبار سے متحدہ ہندوستان کے لیے بہت حساس اور اہم رہا ہے- اس زمانے میں ایک طرف انگریزی اقتدار سے استخلاص وطن کی کوشش زوروں پر تھی تو دوسری طرف آزادی وطن کے ساتھ مسلم لیڈروں، دانشوروں اور علما کا ایک بڑا طبقہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان کی شکل میں ایک علیحدہ ملک کا خواہاں تھا- اس خواہش کی تکمیل کے لیے سیاسی سطح پر مسلم لیگ پیش پیش تھی، جس کی قیادت محمد علی جناح کررہے تھے، جب کہ مذہبی سطح پر اکابر علمائے اہل سنت نے ۱۹۲۵ء میں ''سنی کانفرنس'' کی تشکیل کی تھی، جس کا صدر پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری کو بنایا گیا تھا- لیگ اور کانفرنس کا مقصد ایک تھا، مگر دونوں ہر دوسطح پر الگ الگ قیام پاکستان کے لیے کوشاں تھیں- تاہم ایک وقت آیا جب سنی کانفرنس مسلم لیگ کے ساتھ ہوگئی، جس سے اہل سنت کے چند معاصر علما (جو سنی کانفرنس میں شامل نہیں تھے) لیگ اور جناح کے مذہبی نظریات کی وجہ سے مخالفت کرنے لگے اور پھر کانفرنس کے خلاف چند علما کی جانب سے تلخ مضامین کی اشاعت نیز سنگین الزامات اور اعتراضات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا-

اس سلسلے میں پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری نے بحیثیت صدر سنی کانفرنس ''مسلم لیگ کی شرعی حیثیت'' کے عنوان سے ایک مختصر تحریر ''الفقیہ'' امرتسر شمارہ ۲۱-۲۸/ جنوری ۱۹۴۶ء میں شائع کروائی، جس میں ضمنی طور پر سرسید احمد خاں کو نہ صرف ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھ دیا بلکہ عمداً ایسا لکھنے کے اسباب بھی بیان کیے- اس کے بعد سرسید کے مذہبی عقائد وافکار پر بحث کا سلسلہ شروع ہوگیا، جس میں قارئین کے ساتھ پروفیسر مولانا حامد

حسن قادری اور علامہ ارشد القادری نے نمایاں حصہ لیا-

اس بحث یا مکالمے کے مطالعے کے دوران چند باتیں واضح طور پر محسوس ہوئیں:

۱- اس بحث کو ہوئے تقریباً ۷ر دہائیاں گزر چکی ہیں، اس لیے یہ تاریخی حیثیت کی حامل ہے، جس کے ذریعے اس عہد میں علما کے افکار اور ان کی سرگرمیوں کو جاننے کا موقع ملتا ہے-

۲- مذہبی مباحث میں عموماً جدلیاتی اور مناظراتی منظر دیکھنے کو مل جاتا ہے، لیکن اس بحث میں مخاطب کے لیے حتی الامکان سنجیدہ اور متین لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے اور دلائل کی قوت سے اپنی بات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے-

۳- بحث میں شامل تحریروں کے لکھنے والوں میں سب سے کم عمر علامہ ارشد القادری تھے، جن کی عمر اس وقت محض ۲۱ر سال تھی، مگر تحریر میں پختگی، قوت بیان، ادیبانہ اور عالمانہ رنگ سب میں نمایاں ہے-

ان خصوصیات کے پیش نظر خیال گزرا کہ کیوں نہ اس تاریخی بحث کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ عوام وخواص کے لیے استفادے کا باعث ہو- اس خیال کے نتیجے میں یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے-

اس کتاب کی ترتیب میں ہم نے متن کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی ہے- البتہ بحث میں شامل مضامین اور مراسلے کی اشاعت ''الفقیہ'' کے کس شمارے اور سن میں ہوئی ہے، اس کی تفصیل متن کے ذیل میں فراہم کر دی ہے- قرآنی آیات اور احادیث کی تخریج کا اہتمام کیا گیا ہے، جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں حاشیہ لکھ دیا گیا ہے اور بحث کے پس منظر، پیش منظر اور اس سے متعلق شخصیات اور اخبار کو سمجھنے اور جاننے کے لیے ایک تفصیلی مقدمہ سپرد قلم کیا گیا ہے- مقدمے اور حواشی میں حوالہ دیتے وقت ہم نے قوسین میں صرف کتاب کے نام اور صفحہ نمبر پر اکتفا کیا ہے، مصنف، سن طباعت اور مطبع وناشر کی تفصیلات کتابیات کے ذیل میں درج کر دی گئی ہیں-

کتاب کی ترتیب وتدوین نیز حوالوں کی فراہمی میں میرے دوست مولانا اسید الحق

قادری بدایونی (ولی عہد خانقاہ قادریہ بدایوں) اور محبّ مکرم محمد ثاقب رضا قادری (لاہور) نے خصوصی تعاون کیا ہے۔مرتب کتاب ان دونوں حضرات کا ممنون ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ تاریخی مباحث سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔

خوشتر نورانی

۲۰/جولائی ۲۰۱۳ء

مقدمہ

<u>خوشتر نورانی</u>

سرسید احمد خاں کے مذہبی عقائد وافکار اہل علم کے درمیان ہمیشہ زیر بحث رہے ہیں- پچھلے سو برسوں میں اس حوالے سے متعدد کتابیں، رسائل اور مضامین شائع ہو چکے ہیں- اسی سلسلے کی ایک کڑی زیر نظر کتاب ''سرسید کے مذہبی عقائد وافکار- ایک مکالمہ'' ہے، جس میں متعدد علما نے حصہ لیا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے- اس ضمن میں بہت سے ایسے مسائل بھی سامنے آئے ہیں جو اہل ذوق کے لیے قابل استفادہ اور دلچسپی کا باعث ہیں- یہ خالص مذہبی اور علمی بحث ۱۹۴۶ء میں ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے صفحات میں ہوئی تھی- یہ بحث اور اخبار دونوں اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں- ان گزرے وقتوں میں ایک سے زائد نسل ختم ہو چکی ہے اور متعدد علمی، سیاسی، ملی، صحافتی اور شخصی گوشے بھلائے جا چکے ہیں- زیر نظر مقدمے میں انہی فراموش کردہ حقائق ومعلومات کی تذکیر، نیز سرسید پر علما کے تنقیدی رویوں کی حقیقت، مخالفین اور عقیدت مندان سرسید کے فکری رجحانات، زیر نظر کتاب میں شامل بحث کی نوعیت، اس سے متعلق شخصیات اور دیگر متعلقات کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے-

(۱)

سرسید: ایک مختصر تعارف:

سرسید احمد خاں کی ولادت ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی- حضرت شاہ غلام علی

نقش بندی مجددی دہلوی نے ''احمد'' نام رکھا اور بڑے ہونے کے بعد مکتب بھی پڑھایا۔ سرسید کی ابتدائی تعلیم وتربیت خالص مذہبی اور روحانی ماحول میں ہوئی، کیوں کہ ان کے والد اور دیگر افرادِ خانہ کو دہلی کے دو اہم علمی و روحانی مراکز؛ خانقاہ مجددیہ نقش بندیہ اور خانوادۂ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے گہری عقیدت اور والہانہ تعلق تھا۔ مکتب کے بعد سرسید نے قرانِ کریم پڑھا، پھر فارسی کی درسی کتابیں مثلاً کریما، خالق باری، آمدنامہ، گلستاں، بوستاں وغیرہ پڑھیں۔ عربی کی درسی کتابوں میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر المعانی اور مطول کا کچھ حصہ پڑھا۔ علم ریاضی اپنے ماموں زین العابدین سے سیکھا اور طب حکیم غلام حیدر خاں سے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک، جب سرسید بسلسلۂ ملازمت دہلی کی منصفی پر مامور تھے، اس وقت شاہ مخصوص اللہ دہلوی، شاہ اسحٰق محدث دہلوی اور مولانا مملوک العلی نانوتوی سے اکتسابِ علوم کیا اور اپنی تعلیم مکمل کر لی۔

سرسید نے انگریزی ملازمت کی ابتدا صدر امین کی حیثیت سے کی اور ۱۸۴۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے مین پوری کے منصف مقرر ہوئے اور پھر ملازمت کے سلسلے میں دہلی، بجنور، مرادآباد، غازی پور، علی گڑھ اور بنارس میں مقیم رہے۔ ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے (جہاں مولوی سمیع اللہ خاں دہلوی مجوزہ ایم اے او کالج کا ابتدائی مدرسہ چلا رہے تھے) اور اپنی زندگی کے بقیہ ۲۲/سال اپنے مشن کی تکمیل میں گزار دیے۔ ۱۸۴۱ء میں ہی آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر نے سرسید کو ان کے موروثی خطاب ''جوادالدولہ'' کے ساتھ ''عارف جنگ'' سے سرفراز کیا۔

سرسید نے اپنی ملازمت کے دوران مختلف تصنیفی وتالیفی کام بھی کیے۔ ان میں انتخاب الاخوین یعنی قواعد دیوانی کا خلاصہ، قول متین در ردِ ابطال حرکت زمین، تسہیل فی جر الثقیل، رسالہ اسباب بغاوت ہند، آثار الصنادید اور تاریخ سرکشی بجنور قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی اور تزک جہانگیری کو شائع بھی کرایا۔ گارسن دتاسی نے آثار الصنادید کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا، جسے دیکھ کر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے ۱۸۶۴ء میں سرسید کو آنریری فیلو منتخب کر لیا۔

تصنیف وتالیف کے علاوہ سرسید کو تعلیم سے فطری دلچسپی تھی- اس لیے ملازمت کے دوران ہی انھوں نے ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں فارسی کا مدرسہ اور ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں انگریزی اسکول قائم کر دیا- اس سے قبل ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں ہی سائنٹفک سوسائٹی کا آغاز کیا تھا، جس کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم کی اشاعت تھی- اس سوسائٹی کے مربی وزیر ہند ڈیوک آف آرگائل اور لیفٹنٹ گورنر پنجاب وممالک شمال مغربی اس کے نائب مربی تھے- جب سرسید ملازمت کے سلسلے میں غازی پور سے علی گڑھ آئے تو سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی- اس سوسائٹی کے زیر اہتمام متعدد انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے ہوئے اور ایک اخبار ''علی گڑھ سائنٹفک گزٹ'' بھی نکلا، جس میں معاشرتی اور تعلیمی اصلاحات پر مضامین ہوتے تھے- جب سرسید بسلسلۂ ملازمت علی گڑھ سے بنارس آگئے تو سوسائٹی اور اخبار کا انتظام راجہ جے کشن داس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا-

اب تک سرسید کی تمام تعلیمی، معاشرتی اور اصلاحی کوششیں بلاتفریق مذہب وملت تمام ہندوستانیوں کے لیے تھیں- لیکن قیام بنارس کے دوران ہی کچھ ایسے واقعات پیش آئے، جن سے سرسید کے خیالات یکسر تبدیل ہوگئے- انھیں محسوس ہونے لگا کہ اب ہندو اور مسلمانوں کا ایک قوم کی حیثیت کے ساتھ چلنا ممکن نہیں ہے- اس کے بعد سرسید کی اصلاحات اور تحریک کا دھارا خالص مسلمانوں کی طرف مڑ گیا-

اب وہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے اقدامات کرنے لگے- قیام بنارس کے دوران ہی ۱۸۶۹ء میں سرسید کو اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ انگلستان جانے کے موقع ملا، وہاں انھوں نے انیس مہینے گزارے- اس مدت میں ان پر مغربی علوم کی اہمیت وضرورت مزید منکشف ہوئی اور انگریزوں کی طرز زندگی کو جاننے کا قریب سے موقع ملا- سرسید ۱۸۷۰ء میں مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے مستحکم ارادوں کے ساتھ انگلستان سے واپس آئے اور ایک میگزین ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا، نیز ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' قائم کی- اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک کالج قائم کیا جائے- حکومت نے بھی اس تجویز کو پسند کیا- چنانچہ ''محمڈن کالج فنڈ کمیٹی'' بنائی گئی، جس میں

حکومت کے انگریزی اعلی عہدیداران اور مختلف ریاستوں کے امرا اور نوابین نے دل کھول کر چندہ دیا-۱۸۷۳ء میں سرسید کے صاحب زادے سید محمود نے مجوزہ کالج کے متعلق اسکیم پیش کی-کمیٹی نے منظور کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ پہلے اس کے تحت اسکول قائم کیا جائے-اس طرح ۱۸۷۵ء میں سرولیم میور نے اسکول کا افتتاح کیا-چوں کہ سرسید اب تک بنارس میں ملازمت سے وابستہ تھے،اس لیے اسکول کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری مولوی سمیع اللہ خاں کو دی گئی-۱۸۷۶ء میں سرسید پنشن پا کر علی گڑھ آ گئے-ادھر دیگر ذرائع اور حکومتی امداد سے جب کالج فنڈ کمیٹی کی مالی حالت اچھی ہوگئی تو ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن کے ہاتھوں کالج کا افتتاح ہوا-اس کے بعد سرسید نے اپنی پوری زندگی کالج اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے وقف کردی-اسی زمانے میں انھوں نے متعدد مذہبی اور ملی موضوعات پر رسائل،مضامین اور کتابیں بھی لکھیں،جن میں الدعا والاستجابہ،تحریر فی اصول التفسیر،رسالہ ابطال غلامی،ازالۃ الغین عن ذی القرنین،النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی وغیرہ قابل ذکر ہیں-اسی زمانے میں ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء تا ۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۱ء کے درمیان ۷رجلدوں میں ''تفسیر القرآن'' لکھی-۲۷رمارچ ۱۸۹۸ء کو علی گڑھ میں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے-

سرسید کا مقصد:

دراصل مسلمان ہندوستان میں صدیوں سے حکمراں کی حیثیت سے رہے-لسانی سطح پر اردو،فارسی اور عربی علمی،عوامی اور حکومتی زبان رہی-تعلیمی حیثیت سے علوم قدیمہ اور فنون اسلامیہ رائج رہے-ریاستوں اور جاگیروں پر مسلم امرا اور نوابین کا تسلط رہا اور حکومت کے اعلیٰ مناصب پر بھی عموماً مسلمان فائز رہے-۱۶۰۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی غرض سے ہندوستان میں قدم رکھا اور رفتہ رفتہ تاجر سے تاجدار بن گئے-مسلمانوں سے انگریزوں نے اقتدار ہی نہیں چھینا ، بلکہ ان کے علوم،زبان،ریاستیں،جاگیریں،مناصب اور تمدن بھی چھین لیا-اسلامی علوم کی جگہ مغربی علوم کی اشاعت ہونے لگی،اردو اور فارسی کی جگہ انگریزی حکومتی زبان قرار پائی،قدیم طرز کے مدارس کے مقابل مغربی علوم کے اسکول اور کالجز کھولے جانے لگے اور مسلمانوں سے جاگیریں،ریاستیں اور مناصب چھین لیے گئے-اس

طرح ان کا تہذیبی اور تمدنی سرمایہ بھی داؤں پر لگ گیا- اس تبدیلی نے مسلمانوں کے حواس مختل کر دیے، جب کہ ہندوستان کی دیگر قوموں نے اس تبدیلی کا استقبال کیا اور حکومت کے معاون بن کر علمی، معاشرتی اور معاشی ترقی کی دوڑ میں آگے نکل گئے- مسلمان اس تبدیلی کو کسی سطح پر قبول کرنے کو تیار نہیں تھے، اس لیے بحیثیت قوم ہر شعبے میں ان کا گراف گرتا چلا گیا- انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد صورت حال مزید خراب ہوگئی-

ایسے نازک دور میں سرسید نے محسوس کیا کہ انگریزی حکومت اور حکمراں طبقے سے مسلمانوں کی نفرت اور دوری ان کے زوال کی بنیادی وجہ ہے- اس لیے مسلمانوں کی مجموعی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے قریب آئیں- ان دونوں میں قربت پیدا کرنے کے لیے جو امور لازمی ہیں، انھیں مولانا حالی نے ''حیات جاوید'' میں ذکر کیا ہے، جسے اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

۱- جو مذہبی خیالات مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ بن رہے ہیں، جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، انھیں ختم کیا جائے-

۲- اسلام پر عیسائیوں کا اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے، اس اعتراض کو ختم کیا جائے-

۳- یورپی تمدن کے اصول و فروع اور ان اسباب سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے جو یورپ کی ترقی میں معاون ہوئے-

۴- مذہب سے متعلق بے ہودہ اور مضر رسموں اور خیالات سے مسلمانوں کو نفرت دلائی جائے اور جو اخلاق و عادات قومی انحطاط کی وجہ سے ان میں پیدا ہوگئی ہیں، انھیں بیان کیا جائے-

۵- علوم قدیمہ کی غلطیوں کو ظاہر کیا جائے، کیوں کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کی عظمت بیٹھی ہوئی ہیں اور علوم جدیدہ کی خوبیاں بیان کی جائیں، کیوں کہ وہ ان سے دور و نفور ہیں-

۶- مستشرقین اور مخالفین نے اسلام کے تعلق سے جو خلاف تاریخ اور تحقیق باتیں بیان

کی ہیں، انھیں یا تو علم، عقل اور تاریخ سے منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن ان باتوں سے پاک ثابت کیا جائے۔(حیات جاوید، ص:۶۸-۱۶۹)

مسلمانوں کی ترقی کے مقصد کے پیش نظر مذکورہ تجاویز اور عزائم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرسید نے دو جہتوں سے مسلمانوں کی اصلاحات کا آغاز کیا، وہ جہتیں تھیں؛ تعلیم اور مذہب۔

سرسید کی دو حیثیتیں:

مذکورہ دونوں جہتوں سے سرسید کی نمایاں سرگرمیوں کی وجہ سے ان کی دو حیثیتیں متعین کی جاسکتی ہیں؛ ایک تعلیمی معمار کی اور دوسری مذہبی مصلح کی۔

اپنی پہلی حیثیت میں سرسید نے تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی ترقی کے لیے متحدہ ہندوستان میں تحریک چلائی، اسے تاریخ میں ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جو مدرسۃ العلوم (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی شکل میں بارآور ہوئی۔ معرکہ ستاون کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور معاشی بدحالی پر اس تحریک نے جس طرح قابو پایا ہے، اس کا اعتراف بلاتفریق مذہب وملت سب کو ہے۔

سرسید کی دوسری حیثیت مذہبی مصلح کی ہے۔ اپنی اس حیثیت میں انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی اصلاحات کا آغاز کیا اور مذہبی خیالات کے زیر اثر جو تعلیمی، معاشی اور معاشرتی حدبندیاں مسلمانوں نے مقرر کی تھیں، انھیں ختم کرنے کی کوشش کی، نیز عیسائی حکمراں اور مستشرقین اسلام کے جن اصولوں پر معترض تھے، ان کی توجیہہ وتشریح عقل و سائنس کے ذریعے کرنے کی بنا ڈالی۔ اپنے اس عمل میں سرسید نے اسلام کے ہر اس ثابت کلیے اور عقیدے کی نفی کرڈالی جو ان کے مقاصد کی تکمیل میں مانع تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں اس طرح کے خلاف جمہور عقیدوں پر مشتمل ایک ایسا فرقہ ظہور میں آگیا جو اعتزال کی ایک نئی شکل تھی، جو بلاشبہ تعقل پسندی اور نیچرل سائنس پر استوار تھا، جسے ''فرقۂ نیچریہ'' سے تعبیر کیا گیا۔ دراصل سرسید کا یہی فعل ان کی ذات سے شروع ہو کر ان کی تعلیمی تحریک کی مخالفت کا سامان بن گیا۔

سرسید کے مذہبی عقائد وافکار:

اس بحث کو سمجھنے کے لیے سرسید کے مذہبی عقائد وافکار کو جاننا ضروری ہے، جس سے مسئلے کی سنگینی اور علما کے مخالفانہ رویے کی صحت اور جواز کا اندازہ ہو سکے گا- سرسید کے چند مذہبی عقائد بطور مشتے نمونہ ازخروارے حسب ذیل ہیں:

۱- ملائکہ اور فرشتوں کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے-

۲- نبی پر متعارف فرشتوں کے ذریعے وحی نہیں ہوتی، بلکہ خارجی طور پر وحی کا سرے سے کوئی وجود نہیں-

۳-معراج اور شق صدر کے واقعات رؤیا کا فعل ہے-

۴-قرآن میں جن یا اجنہ کے الفاظ آئے ہیں، ان سے مراد پہاڑی اور صحرائی لوگ ہیں، نہ کہ وہ وہمی مخلوق جو بھوت اور دیو وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے-

۵- جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس پتھر کے بنے ہوئے چوکھونٹے گھر (کعبہ) میں ایک ایسی متعدی برکت ہے، جہاں سات دفعہ اس کے گرد پھرے اور بہشت میں چلے گئے، یہ ان کی خام خیالی ہے- کوئی چیز سوائے خدا کے مقدس نہیں ہے-

۶ -منخنقۂ اہل کتاب، یعنی ایسے پرندے یا جانور جسے اہل کتاب نے گلا گھونٹ کر مارا ہو، اس کا کھانا مسلمانوں کو جائز ہے-

۷-حساب کتاب، میزان اور جنت و دوزخ کا کوئی خارجی وجود نہیں، ان سے متعلق قرآن میں جو ارشادات ہیں وہ بطریق مجاز، استعارہ اور تمثیل کے ہیں-

۸-قرآن مجید کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسی بن باپ کے پیدا ہوئے یا آسمان پر اٹھا لیے گئے-

۹ -اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت کا کوئی خارق عادت نشان دکھا ہی نہیں سکتا - کیوں کہ اگر ایسا ہوا تو اس کی عظمت وقدرت وصنعت کو بٹا لگے گا -

سرسید کے یہ تمام عقائد ان کی ''تفسیر القرآن'' سے ماخوذ ہیں، جس کے بارے میں مولانا حالی نے اپنے ایک مضمون ''سرسید اور مذہب'' میں لکھا ہے، جو مئی ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ

میگزین میں شائع ہوا:

''بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے موجود ہیں، جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیسے ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہوگیا اور کیوں کر ایسی فاش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئیں-'' (حیات شبلی، ص:۲۳۷)

''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''ان کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے مذہب کے متعلق صدہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں ——— اور اپنی سمجھ اور علم اور عقل کے موافق قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی-''

(حیات جاوید: حصہ دوم، ص:۱۴-۱۵)

سرسید سے علما کے اختلاف کی بنیادی وجہ:

مذہب کے تعلق سے سرسید کا یہی رویہ اور مذکورہ عقائد و افکار ملک گیر سطح پر بحث کا موضوع بن گئے- حالاں کہ مسلمانوں کی عمومی ترقی کے لیے سرسید کی جدوجہد، جفاکشی اور جنون کو دیکھ کر ان کی نیت اور خلوص پر شک نہیں ہوتا، تاہم محض خلوص نیت کی وجہ سے اسلام کے موروثی ڈھانچے کے انہدام کا تماشا بھی نہیں دیکھا جا سکتا- عرب و عجم کے علما نے اسی خیال کے پیش نظر سرسید کے مذہبی تفردات کے خلاف سخت تشویش کا مظاہرہ کیا، مضامین و رسائل لکھے، فتوے صادر کیے اور ان میں ان کی تردید و تکفیر بھی کی، کیوں کہ سرسید کے مذہبی افکار کے اثرات سے امت کا ایک بڑا طبقہ اسلام کے اصولی عقائد میں جمہور کی روش سے ہٹ رہا تھا اور ضروریات دین کا منکر ہو رہا تھا-

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سرسید سے علما کا اختلاف خالص مذہبی بنیاد پر تھا- یہ بات درست نہیں ہے کہ انگریزی تعلیم اور جدید علوم کی اشاعت کی وجہ سے علما سرسید کی مخالفت کر رہے تھے- شیخ محمد اکرام نے اس نکتے کی یوں وضاحت کی ہے:

''اس بارے میں سب سے بڑی یہ غلط فہمی بہت عام ہے کہ علما نے

سرسید کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم
رائج کرنا چاہتے تھے-ہم نے سرسید کے موافق اور مخالف تحریروں کا
مطالعہ کیا ہے-ہماری رائے میں یہ خیال غلط ہے اور علما اور اسلام
کے ساتھ صریح بے انصافی ہے-''(موج کوثر،ص:۹۰)

سرسید کی حیات اور تحریک کے نامور محقق ضیاء الدین لاہوری نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے:

''(سرسید کے خلاف)ان فتوؤں کے متعلق اکثر یہ بدگمانی پھیلائی
جاتی ہے کہ فتویٰ باز علما انگریزی پڑھنا کفر جانتے تھے، جب کہ سرسید
انگریزی تعلیم کے زبردست حامی تھے،اس لیے انھوں (علما) نے
سرسید کے خلاف فتوے جاری کیے-''(سرسید اور ان کی تحریک،ص:۱۶)

اس کے ساتھ یہ بات بھی صحیح ہے کہ سرسید کے مذہبی عقائد وافکار کی وجہ سے ان کی ذات کے ساتھ ان کی تحریک کی مخالفت بھی کی گئی-لیکن اس کی بنیاد بھی سرسید کے مذہبی عقائد ہی تھے-علما محسوس کرتے تھے کہ جس شخص کے عقائد وافکار ایسے ہوں،اگر وہ ایک بڑا تعلیمی مرکز قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو لامحالہ وہاں انہی عقائد وافکار کی تعلیم و اشاعت ہوگی-انسانی فطرت اور مزاج کو دیکھیں تو علما کے اس احساس اور خدشے کو غلط نہیں قرار دیا جاسکتا، کیوں کہ عموماً جس فکر ونظر کا انسان حامل ہوتا ہے،اسی کی تبلیغ واشاعت بھی کرتا ہے-تاہم مدرسۃ العلوم اور ایم اے او کالج کی حد تک ایسا کچھ بھی نہیں ہوا-شیخ محمد اکرام اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے
درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے، بلکہ یہی
درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں،وہ مسلمان نہیں اور
جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہتا ہے،اس کی اعانت جائز نہیں-
شروع شروع میں لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسے میں ان

عقائد کی تبلیغ کریں گے، جن کا اظہار وہ اپنے رسائل و کتب میں
کر رہے تھے- سرسید نے ایسا نہیں کیا-'' (ایضاً، ص:۹۱)

سرسید کے خلاف لکھے گئے کئی اہم رسائل و کتب اس وقت مرتب کتاب کے پیش نظر ہیں، ان کے مطالعے سے شیخ اکرام کے مذکورہ قول کی تائید ہوتی ہے- ان نایاب رسائل و کتب میں ''جواہر مضیہ ردنیچریہ'' از مولانا غلام دستگیر قصوری، ''امداد الافاق برجم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق'' از ڈپٹی مولوی امداد العلی اور ''نصرۃ الابرار'' از مفتی محمد لدھیانوی کافی اہم ہیں، کیوں کہ ان رسائل پر متحدہ ہندوستان کے سینکڑوں اکابر علما کے تائیدی دستخط ہیں- ان رسائل سے سرسید کی مخالفت کی ہمہ گیریت اور نوعیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے-

۱-''جواہر مضیہ ردنیچریہ'' مولانا غلام دستگیر قصوری لاہوری (ف:۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) کا ایک اہم رسالہ ہے جو ۱۳۰۴ھ/ ۸۶-۱۸۸۷ء میں مطبع گلزار محمدی لاہور سے شائع ہوا ہے- دراصل ایک صاحب نے ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید سے حدیث تشبہ کی صحت کے تعلق سے سوال کیا، جواب میں سرسید نے لکھا کہ یہ حدیث روایتاً اور درایتاً صحیح نہیں ہے اور پھر تشبہ بالکفار کو درست قرار دیتے ہوئے حدیث مذکور کا انکار کر دیا- سرسید کے اس جواب کو مولوی فضل الرحمٰن نے مولانا غلام دستگیر قصوری کے پاس بھیجا، جس کی تردید میں مولانا قصوری نے یہ رسالہ لکھا- مذکورہ رسالے کی تالیف، غرض و غایت اور خلاصہ اس کے ٹائٹل پیج پر اس طرح لکھا ہوا ہے:

''خان صاحب بہادر (سرسید) سی ایس آئی نے جو اخبار تہذیب الاخلاق میں حدیث صحیح **من تشبّہ بقوم فھو منھم** کو مردود لکھ کر کفار کے شعار میں مشابہت ہر قسم کو روا کر دیا ہے اور نیز تفسیر القرآن میں فرضیت روزہ ماہ رمضان المبارک و حج بیت اللہ شریف کا منکر ہو کر فرشتوں کے وجود اور دوزخ و بہشت کے موجود ہونے کا بھی انکار کر کے نماز میں استقبال قبلہ کو مشابہت بہ بت پرستی لکھ دیا ہے،

پھر دولت مندوں کے واسطے بیاج (سود) لینے دینے کی حلت کا فتویٰ
دے کر سارے نبیوں کے معجزات سے منکر ہو کر حضرت مسیح علیٰ نبینا و
علیہم السلام کے بن باپ پیدا ہونے کو جھوٹ مقرر کر کے آپ کو
یوسف نجار کا بیٹا بنا دیا ہے- الغرض سب دینوں کو جھٹلا دیا ہے تو
غیرت اسلامی کے رو سے محمد عبدالرحمٰن فقیر غلام دستگیر ہاشمی صدیقی
حنفی قصوری فی منقول اور معقول کی سند سے اس کا رد لکھ کر علمائے
دین کی تصدیق سے موئید کرا کر چھپوایا ہے-''

حدیث تشبہ کے انکار پر سرسید کا رد لکھنے کے بعد مولانا قصوری اخیر میں فرماتے ہیں:

''(سرسید نے) اس ایک حدیث کے جواب کے ایک ورق عبارت
میں ۲۴؍ فاحش غلطیاں کی ہیں اور (ان کی) تفسیر القرآن کا حال بھی
کسی قدر راو پر عیاں ہو گیا ہے کہ از سرتا پا غلطی پر مدار ہے، پھر دعوی یہ
ہے کہ ہم سب متقدمین علما کی غلطیاں نکالتے ہیں اور غور سے حق
معلوم کرتے ہیں- افسوس صد افسوس اس خام خیال اور ہزار ہا افسوس
ان کی قوم اور ذرّیات کے چال چلن پر جو ان کو پیشوائے وقت اور سچا
رہنما جانتے ہیں اور ان کے مدرسے کو مدرسۃ العلوم مانتے ہیں، اپنے
مال کا اصراف کرتے ہیں اور اپنی اولاد کو بے دین- پس سب اہل
اسلام کو لازم ہے کہ ایسے بد اعتقادوں کی مجالست اور محبت سے
بچیں-'' (جواہر مضیّہ رد نیچریہ، ص:٦٦)

اس رسالے پر ۴۸؍ اکابر علمائے لاہور، قصور، ریاست بہاول پور وغیرہ کے تائیدی دستخط ہیں، جن میں مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا خلیل احمد انبیٹھوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا غلام محمد بگوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں- رسالے کے اخیر میں ضمیمے کے طور پر مولانا قصوری نے سرسید کے اس عقیدے کا بھی رد کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے نہیں ہوئی ہے-

۲-دوسرا رسالہ ''امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچہ تہذیب الاخلاق'' ہے، جسے ڈپٹی مولوی امداد العلی نے لکھا ہے-یہ رسالہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں مطبع نظامی کان پور سے شائع ہوا-اس میں مصنف کتاب نے سرسید کے ان خلاف اسلام عقائد وافکار کا سختی سے رد کیا ہے، جو ''تہذیب الاخلاق'' کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے-

اس رسالے میں ملک کے اکابر سنی اور شیعہ علما سے استفتا بھی کیا گیا ہے کہ جس شخص کے ایسے خلاف شرع عقائد وافکار ہوں، اس کے ساتھ تعاون کرنا اور اس کے مدرسے میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں-اس استفتا کے جوابات ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں سے دیے گئے کہ ایسے عقائد رکھنے والا کافر وملحد ہے اور اس کے ساتھ تعاون کرنا حرام ہے-ان جوابات پر ۵۰/ سے زائد اکابر علمائے فرنگی محل، دہلی، بھوپال، رام پور اور بریلی کے تائیدی دستخط ہیں، جن میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی، مولانا نقی علی خان اور مفتی سعداللہ مرادآبادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں-

۳-تیسرا رسالہ ''نصرۃ الابرار'' ہے-اس رسالے میں سرسید کے عقائد وافکار کے خلاف مفتی محمد لدھیانوی نے فتویٰ دیا ہے اور سرسید کی تکفیر کی ہے نیز ان کے ساتھ تعاون کو حرام قرار دیا ہے-یہ فتویٰ ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء میں دیا گیا ہے جو مطبع صحافی لاہور سے شائع ہوا ہے-اس فتوے پر ۱۰۰/ سے زائد علمائے لدھیانہ، جالندھر، ہوشیار پور، کپورتھلہ، امرتسر، جموں، گجرات، فیروز پور، قصور، ملتان، پاک پٹن، انبالہ، سہارن پور، دیوبند، گنگوہ، مظفرنگر، دہلی، رام پور، بریلی، مرادآباد، مدینہ اور بغداد کے تائیدی دستخط اور ملاحظات ہیں-ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن دیوبندی، مولانا عبدالغفار خان رام پوری، مولانا ارشاد حسین مجددی، مولانا احمد رضا خاں محدث بریلوی اور مولانا غلام دستگیر قصوری وغیرہ قابل ذکر ہیں-

ان تینوں اہم رسائل کے علاوہ بھی سرسید کی مخالفت میں بے شمار مضامین اور رسائل لکھے گئے اور متعدد فتاوے دیے گئے-لیکن مذکورہ رسائل میں درج فتوؤں پر جس طرح ملک گیر سطح پر علما نے تائیدی دستخط کیے ہیں، انھیں ذاتی مخاصمت، کوتاہ نظری، تعصب وحسد اور

علوم جدیدہ سے بیزاری نہیں کہا جاسکتا-ان مخالفتوں کی بنیاد خالص مذہبی انحراف پر تھی، جس کا سلسلہ دراز ہوکر سرسید کی تحریک تک پہنچا-

سرسید کے رفقا کا مذہبی بنیادوں پر اختلاف: یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سرسید کے مذہبی معتقدات کی وجہ سے نہ صرف بیرونی علما بلکہ سرسید کے قریبی رفقا، ہم نشین اور معاون بھی انھیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے اور حتی الامکان ان کے مذہبی امور و معاملات سے بچنے کی کوشش کرتے تھے-ان میں مولانا الطاف حسین حالؔی، مولانا شبلی نعمانی، وقار الملک سید مشتاق حسین، محسن الملک سید مہدی علی خاں اور ڈپٹی نذیر احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کے تعلق سے ضیاء الدین لاہوری لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے قریب ترین رفقائے کار کی تنقیدیں خاص طور پر قابل غور ہیں، کیوں کہ وہ علی گڑھ مشن کے ستون تھے اور ان علما کے قطعاً زیر اثر نہ تھے جنھوں نے سرسید کے خلاف فتوے جاری کیے اور کروائے-''
>
> (سرسید اور ان کی تحریک، ص:۱۶)

اس کو چند مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے-

مولانا شبلی (ف:۱۹۱۴ء) اور سرسید کے قریبی مراسم تھے، دونوں کے درمیان افادہ اور استفادہ کا رشتہ رہا اور دونوں ایک دوسرے کے قدرداں رہے-مولانا شبلی ۱۸۸۳ء میں بحیثیت اسٹنٹ پروفیسر علی گڑھ آئے اور سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء تک کالج میں رہے، تاہم آخری دنوں میں کچھ وجوہات کی بنا پر مولانا کا سرسید سے اختلاف ہوگیا تھا، ان اختلافات کے اسباب میں ایک بڑا سبب سرسید کے مذہبی عقائد وافکار تھا، جس پر ''حیات شبلی'' میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے-مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''دوسرا سبب مذہبی اختلاف ہے———سید صاحب (سرسید) اپنی تفسیر اور اپنے مضامین میں جو تاویلات کیا کرتے تھے، ان کے لیے وہ مولانا سے جس قسم کی معلومات چاہتے تھے، وہ گو ان کے لیے مہیا کردیتے تھے، مگر وہ خود ان کی اس قسم کی تاویلات کو پسند نہیں

کرتے تھے-''(حیات شبلی،ص:۲۳۷)

آگے لکھتے ہیں:

''اسی تصادم سے بچنے کے لیے سرسید کی زندگی بھر مولانا نے عقائد پر کوئی کتاب کیا، کوئی رسالہ یا مضمون تک نہیں لکھا-سرسید اپنے تہذیب الاخلاق کے لیے تقاضا کرتے تو ٹال جاتے-''

(ایضاً،ص:۲۳۸)

مزید لکھتے ہیں:

''سرسید اپنی تفسیر کا ترجمہ عربی میں کرانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ان کی نظر بار بار مولانا شبلی پر پڑتی تھی،مولانا سے جب اس کا ذکر آیا تو انھوں نے اپنی مصروفیتوں کا عذر کیا-''(ایضاً،ص:۲۴۰)

مولانا شبلی جب اس کام کے لیے تیار نہیں ہوئے تو:

''مولانا(شبلی) کے ماموں زاد بھائی اور شاگرد مولانا حمیدالدین صاحب فراہی پر نگاہ پڑی جو اس زمانے میں عربی کی تکمیل کے بعد کالج میں پڑھتے تھے اور جنھوں نے سرسید کے حکم سے طبقات ابن سعد کے ایک حصے کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا،مگر مولانا حمیدالدین صاحب نے انکار کیا اور جب سرسید نے بہ اصرار اس کی وجہ پوچھی تو صاف کہہ دیا کہ وہ اس باطل کی اشاعت میں تعاون علی الاثم کے گناہ میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے-''(ایضاً،ص:۲۴۰)

سرسید مولانا شبلی سے اپنی سوانح بھی لکھوانا چاہتے تھے،لیکن مولانا اس سے بھی پہلو بچاتے رہے،کیوں کہ ایسی صورت میں سرسید کے مذہبی عقائد پر بھی لکھنا پڑتا-ان عقائد کی وہ حمایت کر نہیں سکتے تھے-اگر انھیں غلط ٹھہراتے تو اختلافات کی خلیج بڑھ جاتی-مولانا سلیمان ندوی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اخیر عمر میں سرسید کی یہ بڑی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری لکھی

جائے، وہ چاہتے تھے کہ یہ کام مولانا شبلی کریں، کیوں کہ وہ پاس رہتے
تھے،مولانا اس سے پہلو بچاتے تھے، چنانچہ اس بارے میں جتنی
بالواسطہ تحریکیں کی گئیں ان کو مولانا بہ لطائف الحیل ٹالتے گئے۔''

(ایضاً،ص:۲۴۲)

یہاں تک کہ سرسید کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کی حیات و خدمات پر مختلف مضامین کا لکھا جانا طے پایا:

''سرسید اور مذہب کا عنوان مولانا شبلی کے لیے تجویز ہوا تو انھوں نے
اس سے انکار کیا، آخر لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر 'سرسید اور اردو
لٹریچر' کا دوسرا عنوان لیا۔'' (ایضاً،ص:۲۴۲)

نواب وقار الملک سید مشتاق حسین علی گڑھ تحریک کے بانیوں میں تھے اور سرسید کے قریب ترین رفقا میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ وہ بھی سرسید کے مذہبی افکار و خیالات سے سخت نالاں تھے۔ سرسید کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر آپ کے ایک خط میں امام ابوحنیفہ پر طعن و تشنیع نہ ہوتی اور آپ
ان کو ضمناً حیلہ باز نہ کہتے تو میں اس جملے کے جواب ہی کو قلم انداز
کر جاتا، لیکن اس بات کی آپ مجھ سے توقع چھوڑ دیں کہ میں ان
پیشوایان دین پر، جنھوں نے نہایت نیک نیتی سے آپ ہی کی مانند
اپنی عمر امت اسلامیہ کی درستی احوال میں صرف کی ہو، تبرا سننے پر
راضی ہوں۔'' (سلیکٹیڈ ڈاکیومنٹ فرام دی علی گڑھ آرکائیوز ص:۱۸۵،
۱۸۶، بحوالہ: سرسید اور ان کی تحریک،ص:۲۴)

اپنے ایک دوسرے مکتوب میں وقار الملک لکھتے ہیں:

''لوگوں کی رائے سے میں آپ کو صحیح صحیح اطلاع دیتا ہوں اور وہ یہ
ہے کہ اس مدرسے کی طرف سے تو اس وقت تک کسی کو شکایت نہیں
ہے۔ ہاں! ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین تازہ کے سبب سے البتہ

لوگوں کو ایک بدگمانی ہے-لیکن وہ بدگمانی آپ کی ذات کے ساتھ ہے، نہ اس مدرسے کی نسبت-'' (ایضاً)

ان تمام احوال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید کی مخالفت کی بنیادی وجہ ان کا مذہبی عقیدہ تھا- اپنی تحریک کے ساتھ اگر وہ اپنے عقائد کی اشاعت میں بھی سرگرم نہیں ہوتے تو تحریک کو اجتماعی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا-مولانا حالی کو بھی اس بات کا اعتراف تھا- وہ لکھتے ہیں:

''اگر سرسید یہ پرچہ (تہذیب الاخلاق) جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا خیال چھوڑ دیتے، بلکہ صرف ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہراً ان کی مخالفت کم ہوتی، بلکہ شاید نہ ہوتی-''

(حیات جاوید، حصہ اول، ص:۱۶۸)

فکری انتہا پسندی:

ہندو پاک میں حمایت و مخالفت کا پیمانہ عموماً فکری انتہا پسندی پر استوار ہے- ہم جب کسی کی حمایت کرتے ہیں تو اس کی تمام خامیوں اور عیوب کو نہ صرف نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ انھیں صحیح ٹھہرانے کی کوشش بھی کرتے ہیں- یوں ہی جب کسی کی مخالفت پر اترتے ہیں تو اس کی خوبیوں کو پس پشت ڈال کر اس کی خامیوں کی اشاعت ہی اپنی زندگی کا ہدف بنا لیتے ہیں- برصغیر ہندو پاک میں حمایت و مخالفت کے یہ مظاہر عام ہیں، جو بلاشبہ معاشرے پر سیاسی تغلب کی نشاندہی کرتے ہیں- یہ انداز فکر و نظر سراسر غیر علمی بھی ہے اور غیر اسلامی بھی- ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ علم و فن اور خدمات کا اعتراف اور عقیدہ و عمل کا احتساب دو الگ الگ چیزیں ہیں- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلی شاعر امرء القیس کو **اشعر شعراء العرب** بھی فرمایا ہے اور **حامل لوائھم الی النار** بھی- پہلا جملہ امرء القیس کی فنی عظمت کا تعارف ہے اور دوسرا جملہ اس کی گمراہی فکر و عمل پر مہر- سرسید کے تعلق سے بھی ہمارا یہی اسلامی رویہ ہونا چاہیے-

سرسید نے مسلمانوں کی عمومی ترقی کے لیے جو غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے

اس کا اعتراف کھلے دل سے کیا جانا چاہیے اور جب بات ان کے عقیدہ و مسلک کی ہو تو ہمارا موقف وہی ہونا چاہیے جو متحدہ ہندوستان کے جمہور علما کا ہے۔ لیکن سرسید کے حوالے سے لوگ دو انتہا پسندانہ طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک طبقہ ان کے کارناموں اور خوبیوں کا اس طرح گرویدہ ہے کہ ان کے مذہبی معتقدات کے خلاف احتجاج کرنے کو بھی دقیانوسیت، تنگ نظری، تشدد اور جہالت سے تعبیر کرتا ہے، علما کو موجب ملامت سمجھتا ہے اور سرسید کے مذہبی معتقدات کی ایسی تاویلات کرتا ہے جو ان کے بھی حاشیہ خیال میں نہیں ہوں گی۔

اس سلسلے میں ضیاء الدین لاہوری لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے بعض عقیدت مند معکوس رویوں کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں کسی نے سرسید کی کسی بات پر اصولی اختلاف کا اظہار کیا، یہ لوگ نفرتوں کے لٹھ لے کر باجماعت باہر نکل آتے ہیں ـــــ علمی بحث میں جب ان سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو خفت مٹانے کی خاطر سرسید کے اعمال و افکار کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جن سے سرسید کی روح بھی کانپ اٹھتی ہوگی۔''
>
> (آثار سرسید، ص:۵۰)

حالاں کہ عقیدت مندان سرسید کو نواب محسن الملک کا یہ قول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے، جو سرسید کے سب سے قریبی رفیق اور بڑے عقیدت مند تھے:

> ''مرحوم سرسید کے خیالات کو سب سے زیادہ جاننے والا اور ماننے والا میں ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص ان کا عقیدت مند اور ان کی عزت کرنے والا نہ ہوگا، لیکن ان کی رائے مثل قرآن و حدیث کے نہ تھی، وہ نبی نہ تھے، وہ معصوم نہ تھے، ان کی گفتگو وحی آسمانی نہ تھی۔ جب ان کا کوئی قول پیش کیا جائے، جو خلاف حدیث ہو تو ہم باوجود ان کی عزت، عظمت و

اقتدار سرتسلیم خم نہ کریں گے۔'' (مجموعہ لیکچرز واسپیچیز نواب محسن الملک، ص:۴۴۲، بحوالہ: آثار سرسید، ص:۴۹)

جب کہ دوسرے طبقے کی نظر صرف سرسید کے مذہبی عقائد وافکار پر ہے، جن کی بنیاد پر ان کی خوبیوں اور کارناموں کا ذکر تک انھیں گوارا نہیں۔ اسلام معتدل فکر وعمل کا داعی ہے، اس نکتے کو ہمیں ہر مقام پر ملحوظ رکھنا چاہیے۔

(۲)

پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری کا فکری تفرد:

زیر نظر کتاب میں سرسید کے مذہبی عقائد وافکار پر بحث کا آغاز پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری (۱۸۴۱ء/۱۹۵۱ء) کا اپنے ایک بیان میں سرسید کو ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہنے اور اس پر اصرار کرنے سے ہوا۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب سرسید کے مذہبی عقائد و افکار کے سلسلے میں متحدہ ہندوستان کے جمہور علما نے اپنا موقف واضح کر دیا تھا تو پھر پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری جیسے جلیل القدر عالم باعمل، مدبر اور شیخ طریقت نے سرسید کو ''رحمۃ اللہ علیہ'' کیسے لکھ دیا؟ پیر صاحب کی زندگی کے مطالعے سے اس کی بظاہر دو بڑی وجوہات سمجھ میں آتی ہیں:

۱۔غلبۂ تصوف وروحانیت ۲۔جذبۂ علودین وملت

مذکورہ دونوں وجوہات کی بنیاد پر پیر صاحب نے علی گڑھ تحریک، تحریک خلافت، سنی کانفرنس، مسلم لیگ، محمد علی جناح اور قیام پاکستان کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ ان کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی پوری قوت ووسائل کے ساتھ میدان عمل میں اتر آئے۔

پیر جماعت علی شاہ کا شمار اکابر علمائے اہل سنت میں ہوتا تھا، لیکن وہ از اول تا آخر صوفی اور شیخ طریقت تھے اور کن صوفیاً فقیھاً کی عملی تصویر بھی۔ اپنی اس حیثیت میں وہ ایک نیک دل، صالح، سادہ طبیعت، متقی اور پرہیزگار انسان تھے، نیز خدا ترسی، جذبۂ ترحم، عفو و درگزر، دادرسی اور عشق رسالت کی دولت سے مالا مال تھے۔ ان کی انہی صفات نے انھیں ملک گیر سطح پر مقبول عوام وخواص بنا دیا تھا، جن کی

قیادت اور سرپرستی میں علما،صلحا اور امرا کو دینی و ملی امور و معاملات میں چلنا بخوشی منظور تھا،اس لیے بالاتفاق علمانے آپ کو''امیر ملت''اور''سنوسی ہند''کے خطابات سے نوازااور معنوی حیثیت سے تسلیم بھی کیا-

خواجہ رضی حیدر لکھتے ہیں:

''امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف میں شاید واحد شیخ طریقت تھے،جن کے عقیدت مندوں کا حلقہ راس کماری سے پشاور تک اور کشمیر سے مدراس تک پھیلا ہوا تھا-آپ کے عقیدت مندوں میں والی افغانستان نادر شاہ اور نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں جیسے حکمراں بھی شامل تھے- امیر ملت اگرچہ بنیادی طور پر عالم اور پیر طریقت تھے،لیکن سیاسی و سماجی معاملات پر بھی آپ کی گہری نظر تھی،لہذا جہاں آپ مذہبی حوالے سے معروف و مقبول تھے وہاں ایک سیاسی مصلح کی حیثیت سے بھی آپ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا-''

(حضرت امیر ملت اور تحریک پاکستان،ص:۱۰-۱۱)

پیر صاحب نے اپنے جذبۂ علو دین وملت کے پیش نظر ہر اس تحریک اور ہر اس شخص کی حمایت کی جو اسلام یا مسلمانوں کی ترقی کے لیے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے تھا-آپ کی ملی سرگرمیوں اور حمایت وتعاون کی چند اہم جھلکیاں ملاحظہ ہو:(تفصیل کے لیے'جہان امیر ملت'،'حضرت امیر ملت اور تحریک پاکستان'اور'سیرت امیر ملت' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے-)

۱)۱۹۱۰ء میں حجاز ریلوے لائن کی تعمیر کے لیے چھ لاکھ روپے کا گراں قدر عطیہ دیا-

۲)۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تعمیر وتوسیع کے لیے لاکھ روپے کا چندہ دیا-

۳)۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت میں قائدانہ اور سرپرستانہ کردار ادا کیا،لیکن ہندو مسلم اتحاد کو سختی سے مسترد کر دیا-

۴)۱۹۲۳ء میں شدھی تحریک کے خلاف سرفروشانہ کارنامے انجام دیے-

۵)۱۹۲۴ء میں کشمیر میں آریہ سماجیوں کی سرکوبی کے لیے مسلسل جدوجہد کی۔

۶)۱۹۲۵ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس مرادآباد کی قیادت اورصدارت فرمائی اور اس تحریک کوکامیاب کرنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ میدان عمل میں اتر آئے۔

۷)۱۹۳۴ء میں ابن سعود نے آپ کوحجاز آنے کی دعوت دی تو اس کے کردار وعمل کے پیش نظر آپ نے دعوت کوقبول کرنے سے انکار کردیا۔

۸)۱۹۳۵ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس بدایوں کی صدارت کی اور مسلمانوں کے لیے قیام پاکستان کے مطالبے کوشدومد سے اٹھایا۔

۹)۱۹۳۶ء میں محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کا بیڑا اٹھایا اور ہندومسلم دو جداگانہ قوموں کی آواز بلند کی تو برصغیر میں سب سے پہلے آپ نے جناح کواپنے بھر پور تعاون کا یقین دلایا۔

۱۰)۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی حمایت میں جمعیت علمائے اسلام پنجاب کے اجلاس کی لاہور میں صدارت فرمائی۔

حالاں کہ جناح بظاہر انگریزی وضع قطع میں رہتے، داڑھی نہیں رکھتے اوران کے اسلامی افکارونظریات پربھی انگلیاں اٹھتیں، مگر چوں کہ وہ ایک ایسی تحریک لے کر اٹھے تھے جس سے بظاہر مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی، قیام پاکستان کی شکل میں نظام مصطفوی کے اجرا کی توقع اور مسلمانوں کی مجموعی ترقی کی آس تھی اس لیے جناح کے شخصی احوال کوانھوں نے نظرانداز کرتے ہوئے ان کی ظاہری ملی سرگرمیوں اوراخلاص کی بنیاد پران کی حمایت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور ۳۰/اکتوبر ۱۹۴۵ء کوروزنامہ ''وحدت'' دہلی میں یہ اعلان کردیا تھا کہ:

> ''جولوگ مسلم لیگ کی مخالفت کررہے ہیں وہ دشمنان اسلام ہیں۔ اس لیے اہل اسلام کے لیے لازم ہے کہ وہ مخالفین مسلم لیگ کے نہ تو جنازوں میں شریک ہوں اور نہ ان کے مردوں کواپنے قبرستان میں دفن کرنے دیں۔'' (ایضاً،ص:۵۲-۵۳)

اس کے علاوہ اپنے جذبہ علو دین کے پیش نظر اکابر ومشاہیر علما ومشائخ کے سامنے آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس (۱۹۴۶ء) میں جناح کے لیے یہاں تک اعلان کر دیا تھا کہ

''جناح کو کوئی کافر کہتا ہے، کوئی مرتد بتاتا ہے، کوئی ملعون ٹھہراتا ہے- لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ ''ولی اللہ'' ہے- آپ لوگ اپنی رائے سے کہتے ہیں، لیکن میں قرآن وحدیث کی رُو سے کہتا ہوں-''

(جہان امیر ملت، ص:۱۸۶)

جب لوگ پیر صاحب سے جناح کے کفر واسلام کے تعلق سے سوال کرتے تو فرماتے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کے حقوق کی بازیابی کے لیے وہ لڑ رہا ہے، اس حیثیت سے وہ ہمارا وکیل ہے اور اپنے وکیل کی ہمیں حمایت کرنی چاہیے- ہم نے نہ اس سے رشتہ داری کی ہے اور نہ اسے اپنا مذہبی رہنما سمجھا ہے- ایک بار ایک شخص نے ایسا ہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا:

''تمھیں کون سی اس کے ساتھ رشتہ داری کرنی ہے جو اس کا مذہب دریافت کرتے ہو-''

پھر ارشاد فرمایا:

''ہم نے جناح صاحب کو اپنا امام یا قاضی یا نکاح خواں مقرر نہیں کیا، بلکہ وہ ہمارے وکیل ہیں- ہم سب کا کام ہے جسے وہ کر رہے ہیں، یہ پوچھنے سے کیا حاصل کہ ان کا مذہب ومسلک کیا ہے-''

(ایضاً، ص:۱۸۷)

دراصل پیر صاحب کا مطمح نظر ہمیشہ اسلام اور امت مسلمہ کی سربلندی رہا- یہ کام خواہ رجل فاجر کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، اسے وہ غنیمت سمجھتے اور اس کی حمایت وتعاون میں سرگرم ہو جاتے ـــــ اس تفصیل سے بتانا مقصود یہ ہے کہ سرسید کی ذات اور ان کی تحریک کے ساتھ بھی پیر صاحب کا یہی رویہ رہا اور اپنے اسی پرخلوص اور دین پرور رویے کے تحت انھوں نے سرسید کے مذہبی عقائد وافکار کو دیکھنے کی بجائے ان کے اس خلوص اور جد وجہد کو

دیکھا جو وہ مسلمانوں کے لیے کر رہے تھے- پیر صاحب کے اس جذبۂ علو دین کے ساتھ ان کا غلبۂ تصوف اس پر مستزاد، جو ہمیشہ انھیں حسن ظن، سادہ لوحی اور رواداری کی ترغیب دیتا-

ایک واقعہ:

حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری کی للّٰہیت، اخلاص اور سادہ لوحی کو اس ایک واقعے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، جسے ان کے پوتے صاحب زادہ سید اختر حسین شاہ نے ''سیرت امیر ملت'' میں ذکر کیا ہے- وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ لاہور میں مسلم لیگ کا جلسہ تھا- علامہ مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی (سر پرست: دارالعلوم دیوبند) بھی جلسے کی شرکت کے لیے آئے تھے- انھوں نے حضرت قبلہ عالم (پیر صاحب) رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ: ''میں نے سنا ہے اہل لاہور میرے درپئے آزار ہیں- ایسا کیوں ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''مولوی صاحب! لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کرتے ہیں-'' مولوی صاحب (شبیر عثمانی) نے کہا: ''میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کرنے والے کو کافر اور مرتد سمجھتا ہوں- یہی میرا عقیدہ ہے- میں کیسے گستاخی کا ارتکاب کر سکتا ہوں-'' حضرت قبلہ عالم رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے اور آپ نے علامہ صاحب کو گلے لگا لیا اور فرمایا: ''علامہ شبیر احمد صاحب میرے بھائی ہیں- خبردار! ان سے کوئی گستاخی نہ ہو- میرے سامنے انھوں نے اپنے عقیدے کی وضاحت کر دی ہے-'' (سیرت امیر ملت، ص: ۱۴۵)

(۳)

زیر نظر کتاب میں شامل سرسید کے مذہبی عقائد پر بحث، ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر میں ہوئی، اس لیے یہاں اس کے ایڈیٹر اور اخبار کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے- دونوں کی

خدمات کی تابناک تاریخ رہی ہے، مگر آج ان سے کم ہی لوگ واقف ہیں-

ایڈیٹر ''الفقیہ'' امرتسر: ایک تعارف:

مولانا حکیم ابوالریاض معراج الدین احمد ایڈیٹر ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر تاریخ کا ایک فراموش کردہ نام ہے- مولانا کی ذات اور ان کی فقید المثال صحافتی، ملی، سیاسی اور دینی خدمات کے ذکر سے زبان وقلم عموماً خاموش ہیں- حالاں کہ مولانا معراج الدین نے اپنی صحافت کے ذریعے انیس ویں صدی کے نصف اول تک اہل سنت وجماعت کی دینی، ملی اور سیاسی تحریکوں کو مستحکم کیا، تحریک خلافت اور تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا، مذہب حنفی کی اشاعت میں پورے جوش وولولے کے ساتھ حصہ لیا اور اپنی سیاسی اور ملی سرگرمیوں کی وجہ سے قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں-

مولانا حکیم معراج الدین احمد ابن حکیم محمد ابراہیم ۷راپریل ۱۸۸۶ء کو امرتسر (انڈیا) میں پیدا ہوئے- آپ کے والد امرتسر کے معروف طبیب حاذق تھے- مڈل پاس کرنے کے بعد آپ نے بابائے طب حکیم غلام رسول امرتسری سے علوم دینیہ کی تحصیل کی اور علم طب بھی پڑھا- اوائل عمری میں ہی حضرت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری (۱۸۴۱ء/1951) سے بیعت ہوگئے- اپنی دینی وملی سرگرمیوں اور زہد وتقویٰ کی بنا پر محدث علی پوری کے خاص مریدوں میں آپ کا شمار ہونے لگا- تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے والد کی نگرانی میں مطب شروع کیا اور جلد ہی اس میدان میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا دیا- مولانا کی وفات پر ان کے رفیق خاص مولانا حبیب، مدیر روزنامہ ''غازی'' لاہور نے جو تعزیتی مضمون لکھا ہے، اس میں ذکر کیا ہے کہ:

> ''آپ اول درجے کے طبیب حاذق تھے- مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ کبھی امرتسر سے آتے اور گھر میں کوئی بیمار زیر علاج ہوتا تو چھوٹا سا نسخہ بنا دیتے، جس کے استعمال سے مریض یوں اچھا ہوجاتا گویا وہ بہانے کر رہا تھا- اکثر بیمار ایسے ہوتے جو مدت سے زیر علاج رہ چکے تھے، لیکن خدا انھیں بھی شفا دیتا- سبب یہ کہ مرحوم بطور طبیب فیس یا

معاوضہ لینا گناہ سمجھتے تھے اور تا حد امکان دوا بھی مفت دیتے تھے،
اس لیے شافی مطلق نے ان کو دست شفا عطا کر رکھا تھا-''

(ہفت روزہ الفقیہ، گوجرانوالہ، ص:۲، شمارہ: نومبر ۱۹۴۸ء)

علم طب کے ساتھ آپ کو علم و ادب اور صحافت سے غیر معمولی دلچسپی تھی، جس کے ذریعے آپ نے دین و مسلک اور مذہب و ملت کی بے بہا خدمات انجام دیں- کیوں کہ دین و ملت کی سر بلندی اور قومی ترقی کا جذبہ آپ کے دل و دماغ میں موجزن تھا- مولانا کے صاحب زادے فیاض الدین احمد لکھتے ہیں:

''میں ان کا فرزند ہونے کے باعث ان کے دل کی گہرائی کو اچھی طرح جانتا تھا- فقط یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ دل میں قومی، دینی اور ادبی جذبہ رکھتے تھے-'' (ایضاً، ص:۳)

مولانا اپنے جذبۂ دینی و ملی کے تعلق سے اپنی ایک تصنیف کے دیباچے میں خود لکھتے ہیں:

''میرے دل میں قوم کی محبت ہے، مجھے قوم کی ترقی اور خیر خواہی مطلوب ہے- لیکن یہ ہمدردی، یہ وفاداری، یہ محبت ذاتی اغراض کی بنا پر محمول نہیں ہے، بلکہ قوم کی خیر سگالانہ خدمت مدنظر ہے-'' (ایضاً)

اسی جذبے کے پیش نظر مولانا نے ایک اخبار ''کامریڈ'' نکالا اور مسلمانوں کے خلاف کانگریس کی غلط پالیسیوں کو بے نقاب کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کی- اس کے بعد ایک کتاب ''کانگریس کا کچھا چٹھا'' بھی لکھی- بقول فیاض الدین احمد:

''یہ کتاب اس وقت اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن چھپ گئے- (ایضاً)

اس کے بعد پنجاب میں اکالی تحریک کے خلاف ایک اور اخبار ''تھہہ سوٹا'' جاری کیا اور مذکورہ تحریک کی زیادتیوں کو عوام اور حکومت کے سامنے جرأت کے ساتھ پیش کیا-
مذکورہ اخبارات جاری کرنے کے علاوہ آپ نے مختلف اخبارات و رسائل کی ادارت

بھی کی، جن میں ''ہنٹر''، ''رفیق صادق''، ''اخبار جماعت''، ''حنفی'' اور ''المعین'' قابل ذکر ہیں- اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا معراج الدین نے اپنے ادارتی تجربات، علمی رسوخ اور محنت ولگن سے ان تمام اخبارات ورسائل کو مقبول بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا- ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ ''المعین'' میں مولانا کا ایک مضمون شائع ہوا، جو حکومتی پالیسی کے خلاف تھا، اس پر انگریزی حکومت نے ضمانت طلب کر لی، مگر قومی اور دینی حمیت کے پیش نظر آپ نے اس کی ضمانت دینا گوارا نہیں کیا- محمد صادق قصوری لکھتے ہیں:

> ''حکومت کی طرف سے ضمانت طلبی کا یہ پہلا وار تھا، جو ''المعین'' سے شروع ہوا اور اب تک رائج ہے- احباب نے ضمانت کے لیے رقم کی پیش کش کی، مگر آپ نے حکومت کو ایک کوڑی دینا گوارا نہیں کیا-'' (تحریک پاکستان اور علمائے کرام، ص:۱۵۱/۱۵۲)

ارائیں قوم کی تنظیم واتحاد کے لیے ستمبر ۱۹۱۴ء میں آپ نے ''انجمن راعیان ہند'' کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت ''راعین میگزین'' جاری کیا- آپ کی کوششوں سے انجمن راعیان ہند کا پہلا اجلاس لاہور میں سر میاں محمد شفیع (۱۸۶۹ء/۱۹۳۲ء) کی صدارت میں ہوا- اس اجلاس کی کامیابی نے متحدہ ہندوستان میں ارائیں قوم کو متحرک وفعال بنا دیا- اسی سلسلے میں آپ نے ''تاریخ ارائیں'' بھی لکھی- آپ ہی کی تحریک پر قاضی فتح محمد امرتسری نے انجمن راعیان ہند کے تعاون سے ہفت روزہ ''الراعی'' نکالا- ارائیں قوم کے لیے آپ کی گراں قدر خدمات کے پیش نظر مولانا محمد حسین عرشی (۱۸۹۲ء/ ۱۹۸۵ء) نے اپنی ایک نظم میں آپ کو راعیوں کا ''سرسید'' لکھا ہے- انجمن راعیان ہند کی تنظیم واشاعت کا کام اہل لاہور نے سنبھال لیا تو آپ کی تمام تر توجہ دین ومسلک کی اشاعت کی طرف مبذول ہوگئی-

پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری کے خلیفہ خاص مولانا غلام احمد اخگر امرتسری (۱۸۶۴ء/ ۱۹۲۷ء) نے ایک اخبار ''اہل فقہ'' نکالا- اس اخبار نے دین ومسلک کی جو نمایاں خدمات انجام دیں وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے- اس اخبار سے بھی مولانا حکیم معراج الدین عرصے تک منسلک رہے- کچھ عرصے کے بعد جب یہ اخبار بند ہو گیا تو مولانا

نے ۵؍جولائی ۱۹۱۸ءکوامرتسر سے ''الفقیہ'' جاری کیا- آگے چل کر یہ اخبار مولانا کی دینی وملی جدوجہد اورسیاسی سرگرمیوں کا نشان امتیاز بن گیا- یہ مولانا کے ذریعے پہچانا جانے لگے اور مولانا کو اس کے ذریعے شہرت وعزت ملی- (تفصیل آگے آ رہی ہے)

مولانا معراج الدین نے اپنے پیرومرشد پیر جماعت علی شاہ کی قیادت میں تحریک خلافت میں بھی بھر پور حصہ لیا، تاہم وہ ہندومسلم اتحاد کے قائل نہیں رہے- مولانا ''جمعیت خدام الحرمین'' کے تاسیسی رکن بھی تھے- اس کا پہلا اجلاس ۷؍اکتوبر ۱۹۲۷ءکولاہور میں ہوا ،جس میں اکابر علما اور دانشوروں نے شرکت کی- اس اجلاس کی کامیابی میں مولانا کا نمایاں حصہ رہا- اپنی دینی، ملی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے مولانا کو دو بار قید وبند کی اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں- پہلی بار آپ ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ امرتسر کے سانحے میں گرفتار ہوئے اور دوسری بار ۱۹۴۷ء میں جب امرتسر کے اندر فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا تو آپ کو بھی پابند سلاسل کیا گیا-

مولانا معراج الدین نے تحریک پاکستان میں بھی نمایاں حیثیت سے حصہ لیا تھا، اس لیے انھیں قیام پاکستان کے بعد اپنی موروثی دولت، امارت، گھر بار اور نادر کتب خانہ چھوڑ کر لاہور ہجرت کرنا پڑا، جس کا غم انھیں آخری دم تک رہا- اپنی ایک آپ بیتی میں مولانا اپنے اس غم کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''وہ دیار عزیز جس کی ہوا میں اس جسم خاکی نے پہلا سانس لیا، جس کے دلکش مناظر پر اس کی نوزائیدہ آنکھ نے پہلی نگاہ ڈالی، جس میں اپنی عمر کے پورے ۶۵؍برس اس امید پر گزار دیے کہ یہیں جینا ہے، یہیں مرنا ہے اور اسی خاک سے اٹھ کر شفیع داور محشر کے حضور حاضر ہونا ہوگا- اسی خاک میں اپنے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں مدفون ہیں اور یہی اپنا آخری ٹھکانہ ہوگا- یہ بات کبھی حاشیہ خیال میں بھی نہیں گزری تھی قضائے مبرم کا اٹل حکم لاکھوں انسانوں کو زمین گیر سیلاب میں بہے جانے والے تنکوں کو اناً فاناً اِدھر سے اُدھر دھکیل

کر پھینک دے گا- انسانیت کی پوری تاریخ اس تباہی و بربادی کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے-''

(الفقیہ، گوجرانوالہ،ص:۲،شمارہ:۷راگست ۱۹۴۸ء)

۱۹۴۷ء میں پاکستان ہجرت کرنے کے ایک سال کے بعد ہی ۶رمحرم الحرام ۱۳۶۸ھ / ۹رنومبر ۱۹۴۸ء بروز منگل کو لاہور میں آپ کا وصال ہو گیا اور قبرستان میانی صاحب لاہور میں دفن ہوئے-

آپ کے وصال کے بعد ۱۴راگست ۱۹۹۶ء کو تحریک پاکستان ورکرز ٹرسٹ لاہور نے آپ کی گراں قدر خدمات کے صلے میں آپ کو''تحریک پاکستان گولڈ میڈل'' دیا، جسے آپ کے صاحب زادے فیاض الدین احمد نے وصول کیا-

ہفت روزہ''الفقیہ'' امرتسر: ایک تعارف:

۵رجولائی ۱۹۱۸ء کو مولانا حکیم معراج الدین احمد نے امرتسر سے''الفقیہ'' کو جاری کیا- یہ اخبار اہل سنت و جماعت کی تحریکی، ملی اور مذہبی سرگرمیوں کی اشاعت کا سب سے بڑا پلیٹ فارم تھا، جس کے ذریعے اہل سنت و جماعت نے سیاسی اور ملی کامیابیوں کے مختلف مراحل طے کیے- اس کے قارئین کا حلقہ ہندوستان کے علاوہ مشرق میں بنگال، برما سری لنکا اور مغرب میں ریاست ہائے بہاول پور اور بلوچستان کے قصبوں اور دور دراز علاقوں تک وسیع تھا- ابتدا میں مولانا معراج الدین کے ساتھ مولانا غلام احمد اخگر اور مولانا محمد شریف کوٹلوی (۱۸۶۱ء/ ۱۹۵۱ء) بھی اخبار کی ترتیب میں تعاون کرتے رہے- مولانا اخگر کی وفات ۱۹۲۷ء کے بعد مولانا محمد عالم آسی امرتسری (۱۸۸۱ء/۱۹۴۴ء) اور حکیم محمد موسی امرتسری کے بڑے بھائی حکیم غلام قادر (۱۹۰۸ء/ ۱۹۷۵ء) مدیر''الفقیہ'' کے معاون رہے-

یہ اخبار بڑے سائز میں ۱۲رصفحات پر تین کالمز میں نکلتا تھا اور عموماً ہر انگریزی مہینے کی ۷-۱۴اور۲۱-۲۸ تاریخ کو شائع ہوتا تھا-''الفقیہ'' کا اشاعتی دورانیہ ابتدا میں پندرہ روزہ تھا، لیکن یکم مئی ۱۹۲۴ء سے ہفت روزہ ہو گیا-''الفقیہ'' بنیادی طور پر ایک مذہبی اور ملی اخبار تھا، جس کے اہم مقاصد میں مسلمانوں اور مذہب حنفی کی حمایت و اشاعت تھی- اخبار کے ہر

شمارے کے سرورق پر عموماً مذکورہ مقاصد اس طرح درج ہوتے تھے:

''اغراض ومقاصد: اہل اسلام کی عموماً اور احناف کی خصوصاً حمایت وخدمت کرنا''

اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ''الفقیہ''، مسلسل ۳۵ر برسوں تک نکلتا رہا اور اپنے پرجوش اداریے، فکرانگیز مضامین، دلچسپ مشمولات اور معاصر تحریکی سرگرمیوں اور مسائل پر گرما گرم مباحث کی وجہ سے برصغیر کا مقبول ترین اخبار بن گیا- ''الفقیہ'' اہل سنت و جماعت کا واحد نمائندہ اخبار تھا جو متحدہ ہندوستان میں کثرت سے پڑھا جاتا تھا- ہر شمارے میں اس کی پیشانی پر حسب ذیل عبارت لکھی ہوتی تھی:

''ہندوستان بھر میں اہل سنت والجماعت کا واحد آرگن''

''الفقیہ'' کی جتنی فائلیں دستیاب ہوسکی ہیں، انھیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اخبار کا کوئی مستقل کالم نہیں تھا، بلکہ حالات کے پیش نظر اس میں متفرق تحریریں اور مضامین شامل کیے جاتے تھے، جن میں زیادہ تر مشمولات مذہبی اور ملی نوعیت کے ہوتے تھے- مذہب حنفی کی حمایت میں بھی اکثر تحریریں ہوتی تھیں- اس ضمن میں غیر مقلدیت اور فرقہ اہل حدیث کا رد بھی ہوتا تھا- مرتبین اخبار محسوس کرتے تھے کہ خلافت عثمانیہ ترکی کے سقوط کے بعد سعودی حکومت کے زیر اثر ہندوستان میں سلفیت اور فرقہ اہل حدیث کا بڑھتا اثر تقلید مذاہب، خصوصاً مذہب حنفی کے لیے خطرے کا باعث ہے، اس لیے انھوں نے حنفیت کی اشاعت اور اس کے تحفظ کو اخبار کے بنیادی نصب العین میں شامل کرلیا تھا- مدیر ''الفقیہ'' لکھتے ہیں:

> ''اس وقت حنفیت کو جو عظیم خطرات درپیش ہیں، ان کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جو حالات پر پوری نظر رکھتے ہیں- ایک طرف بین الاسلامی فتنے ہیں جو بڑے زور سے اٹھ رہے ہیں، دوسری طرف بین الاقوامی مسائل ہیں جن کا سامنا ہے- علمائے احناف کو وقت کی نزاکت کا پورا احساس دلانے کے لیے ضرورت ہے الفقیہ کو نئی ضرورتوں کے مطابق ترتیب دیا جائے-''
>
> (الفقیہ، گوجرانوالہ، ص:۳، شمارہ: ۷ر اگست ۱۹۴۸ء)

مذہب حنفی کی اشاعت اور تحفظ کے علاوہ اس اخبار کا نمایاں وصف تحریک پاکستان اور ''سنی کانفرنس'' کی حمایت اور ان حوالوں سے علما کی سرگرمیوں، مباحث اور اختلافات فکر و نظر کی اشاعت تھی- علامہ ارشد القادری (۱۹۲۵ء/۲۰۰۲ء) نے اپنے ایک انٹرویو میں ذکر کیا ہے کہ:

> ''۱۹۴۴ء میں میری فراغت ہوئی تھی- فراغت سے پہلے ہی میں باقاعدہ مذہبی جلسوں میں جانے لگا اور مضامین بھی باقاعدگی سے لکھنے لگا، جو ہفت روزہ 'الفقیہ' امرتسر میں شائع ہوتے تھے- اس دور میں (الفقیہ میں) مباحثے بھی خوب ہوتے تھے- عموماً ان مباحث کا موضوع آزادی ہند اور قیام پاکستان ہوا کرتا تھا-''
>
> (ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی، ص:۲۷)

آزادی ہند، تحریک پاکستان اور سنی کانفرنس کے حوالوں سے ''الفقیہ'' میں جو بحثیں ہوتی تھیں، اس کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ ایک بار اہل سنت و جماعت کے ایک معروف عالم دین نے ایک مضمون لکھا، جس میں سنی کانفرنس اور مسلم لیگ پر کچھ اعتراضات کیے- ''الفقیہ'' میں جب یہ مضمون شائع ہوا تو اس کے جواب میں متعدد مضامین اور خطوط شائع ہوئے، ان میں کچھ خطوط ایسے بھی تھے، جن میں مدیر ''الفقیہ'' کو سنی کانفرنس اور مسلم لیگ کا مخالف قرار دیتے ہوئے ''الفقیہ'' کے بائیکاٹ کی دھمکی بھی دی گئی- ایسے خطوط کے جواب میں مدیر الفقیہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے سنی کانفرنس یا لیگ کا مخالف کہنا سراسر ناانصافی اور غلط فہمی ہے- سنی کانفرنس کا مخالف رہ کر اور لیگ کا دشمن بن کر میں الفقیہ کی ہر اشاعت میں کئی کئی کالموں میں سنی کانفرنس اور لیگ کے پروپیگنڈے کے لیے کیسے وقف کر سکتا تھا- الفقیہ کی ہر اشاعت میں سنی کانفرنس کا ابتدا سے ہی اعلان ہو رہا ہے اور ہر اشاعت میں لیگ کا پروپیگنڈہ ہوتا ہے-''

(الفقیہ، امرتسر، ص:۹، شمارہ:۲۱-۲۸/جنوری ۱۹۴۶ء)

مذکورہ اقتباس سے اخبار کے مشمولات اور مباحث کا اندازہ ہوتا ہے-

دراصل ۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی-اس کے بعد سے ہی ''الفقیہ'' نے تحریک پاکستان کی حمایت میں اپنے آپ کو پوری تندہی سے وقف کر دیا تھا- محمد صادق قصوری لکھتے ہیں:

''۲۳/مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو حکیم صاحب (مولانا معراج الدین احمد) نے الفقیہ کے صفحات تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے وقف کر دیے-آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا سنی کانفرنس کی خبریں نمایاں طور پر شائع کر کے اور تحریک پاکستان کے حق میں اداریے لکھ کر تحریک کو تقویت بخشی-''

(تحریک پاکستان اور علمائے کرام، ص:۱۵۴)

یہ بات بھی بڑی حیرت انگیز اور دلچسپ ہے اور تحریک پاکستان سے ''الفقیہ'' کی جذباتی وابستگی کی روشن دلیل بھی کہ ۱۹۴۲ء کے آغاز سے اس نے ''امرتسر'' کے ساتھ لفظ ''پاکستان'' کا اضافہ کر دیا تھا-اب اس کی پیشانی پر یوں لکھا ہوتا: ''الفقیہ'' امرتسر (پاکستان)''

حالاں کہ وہ دور ہندوستان کے سیاسی حالات اور جنگ عظیم دوم کی وجہ سے بہت حساس تھا-اس نازک دور میں امرتسر کے ساتھ لفظ پاکستان کا اضافہ ایک طرف انگریزی حکومت کے غیظ وغضب کو دعوت دے سکتا تھا تو دوسری طرف آزادی ہند کی تحریک میں حصہ لینے والے غیر مسلم لیڈران کی پیشانی پر بل ڈال سکتا تھا-لیکن اپنے انجام سے بے پرواہ ہو کر ''الفقیہ'' نے اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا-

''الفقیہ'' کی مذکورہ ملی، تحریکی اور مذہبی خدمات اور جہد مسلسل کی وجہ سے اسے اکابر علمائے اہل سنت کی حمایت وتعاون حاصل تھا-پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری نے تو اس کے اخلاص اور دینی وملی جذبے کو دیکھ کر یہ اعلان کر دیا تھا:

''فقیر کے یاران طریقت میں جو آدمی اردو پڑھ سکتا ہے، اسے لازم

ہے کہ اخبار الفقیہ ضرور خریدے اور پڑھے اور جو اردو پڑھنے والا اس
اخبار کو نہ خرید کر پڑھے گا اس کا فقیر سے کوئی تعلق نہیں۔''

(الفقیہ، امرتسر، جلد: ۷ص: ۱، شمارہ: ۲۰ر جنوری ۱۹۲۴ء)

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی (۱۸۵۶ء/ ۱۹۲۱ء) نے ''الفقیہ'' کے مشمولات اور اغراض و مقاصد کو دیکھتے ہوئے اپنے خاندان کے ۱۲ر افراد کے نام اس اخبار کو جاری کروایا اور اس کی ممبر شپ کے لیے ۳۶ر روپے منی آرڈر کیے نیز مدیر اخبار مولانا حکیم معراج الدین کو ایک خط لکھ کر ''الفقیہ'' کی ستائش کی۔ فاضل بریلوی کا یہ خط ''الفقیہ'' کے شمارہ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا۔ فاضل بریلوی کے خط پر مدیر الفقیہ کا ادارتی نوٹ اور خط کا متن ملاحظہ ہو:

''الفقیہ کے لیے بڑے فخر کی بات ہے کہ عالی جناب معلیٰ القاب حضرت مجدد مائتہ حاضرہ مولانا الحاج محمد احمد رضا خان صاحب قادری برکاتی بریلوی مدظلہ العالی کی نظر شفقت اثر الفقیہ پر ہوئی۔ آپ نے مبلغ چھتیس روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائے اور ایک عنایت نامہ خاکسار کو لکھا، جس کو بجنسہ درج ذیل کرتا ہوں۔ مولانا ممدوح کا اخبار ''الفقیہ'' کو اپنے خاندان کے اراکین کے نام جاری کرانا الفقیہ کے لیے ایک زبردست سند ہے کہ الفقیہ خالص سنی پرچہ ہے۔ ہم مولانا ممدوح کی اس عنایت کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ مولانا ممدوح اس پرچے پر خاص طور نظر عنایت رکھیں گے جو اس کے دائمی بقا کا ایک ضروری ذریعہ ہے۔ مولانا ممدوح نے قواعد و ضوابط اخبار کی دفعہ ہشتم غیر معقولیت پر اشارہ فرمایا ہے، اس کے متعلق گزارش ہے کہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا مضمون دفتر الفقیہ میں آجاوے جس کا کچھ حصہ خلاف عقیدۂ اہل سنت ہو تو ایسے مضامین پر دفعہ ہشتم حاوی ہوگی۔ لیکن بریلی سے جو

مضمون آئے گا اس کی نسبت ایسا گمان نہیں ہوسکتا، اس لیے بہر حال دفعہ ہشتم کی قید سے مضامین بریلی آزاد ہیں-مولانا ممدوح کا عنایت نامہ یہ ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم-نحمده و نصلى على رسوله الكريم

مولانا المکرّم اکرمکم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اخبار روز شنبہ دو پہر کو آیا-کل یک شنبہ کو جواب لکھا، اتوار کو ڈاک صبح ایک ہی وقت جاتی ہے، لہذا آج مرسل آپ کے عنایت نامہ دربارہ امداد الفقیہ تشریف لائے-سچ گزارش کروں، اول تو یہ خیال رہا کہ آج کل بہت لوگ صرف غیر مقلدوں کو وہابی اور ہر مقلد کو سنی جانتے ہیں-حالاں کہ دیوبندی مدعیان تقلید ان سے اضل سبیل ہیں-اب بعض وجوہ نے بحمدہ تعالیٰ اطمینان دلایا ہے کہ الفقیہ پورا سنی ہے-لہذا کل اپنے گھر ہی سے میں نے ابتدا کی-بفضلہٖ تعالیٰ قادری گھر سے بارہ امدادوں کے چھتیس روپے حاضر کرتا ہوں-امید ہے کہ اخبار ہمیشہ حسام الحرمین و فتاویٰ الحرمین کے مطابق سنی رہے-مولانا! فقیر انتہا درجے کا عدیم الفرصت ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ بعض احباب امداد مضامین بھی کرتے رہیں گے-اگر یہ قبول فرمایا جائے کہ یہاں کے مضامین قواعد وضوابط کی دفعہ ہشتم سے آزاد رہیں گے-(۱) جن صاحبوں کے یہ روپے ہیں، ان کے نام درج کرتا ہوں، اس نشان سے اخبار انھیں روانہ فرمادیں-والسلام

---

(۱)'الفقیہ' نے دفعات کی شکل میں میں کچھ اصول وضوابط متعین کیے تھے، جس کی چھٹی دفعہ (دفعہ ہشتم) میں ذکر تھا کہ جو مضمون نامناسب ہوگا یا ادارے کی پالیسی کے خلاف ہوگا، اس میں قطع و برید کرنے یا اسے شائع نہ کرنے کا اختیار ادارے کو ہوگا-اسی حوالے سے فاضل بریلوی نے لکھا ہے کہ اخبار میں اشاعت کے لیے بریلی سے اسی شرط پر مضامین بھیجے جائیں گے، جب وہ دفعہ ہشتم سے آزاد رہیں گے-**(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)**

فقیر محمد احمد رضا خاں
یکم ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ''

(الفقیہ، امرتسر، شمارہ: ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۸ء)

۷ر جولائی ۱۹۱۸ء سے اگست ۱۹۴۷ء سے کچھ پہلے تک یہ اخبار تسلسل کے ساتھ شائع ہوتا رہا- آزادیِ ہند اور قیامِ پاکستان کے ہنگامے، قتل و غارت گری اور ہجرت کے طوفان میں یہ اخبار بند ہوگیا- قیامِ پاکستان کے بعد مدیر ''الفقیہ'' بھی امرتسر سے لاہور ہجرت کر گئے- چوں کہ مدیر الفقیہ نے نہایت ابتر حالت میں ہجرت کی تھی، اس لیے اپنے ساتھ الفقیہ کی یادوں کے سوا کچھ نہیں لے جاسکے- اپنا عالی شان مکان، لاکھوں کی جائیداد، الفقیہ کا نادر کتب خانہ اور آفس سب کچھ اپنے پیچھے امرتسر میں چھوڑ تو آئے تھے- تاہم ''الفقیہ'' کے بغیر ان کی زندگی ادھوری تھی، اس لیے ۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے لاہور سے ''الفقیہ'' جاری کرنے کے لیے حکومت کو بذریعہ ڈیکلریشن از سرِ نو درخواست دی، جو گوناں گوں مشکلات کے بعد ۲۰ر جولائی ۱۹۴۸ء کو منظور ہوئی اور ۷ر اگست ۱۹۴۸ء کو اس کا پہلا شمارہ گوجرانوالہ پاکستان سے شائع ہوا- اس شمارے میں مدیر نے ''آپ بیتی'' کے عنوان سے جو درد انگیز اداریہ سپردِ قلم کیا ہے، اسے پڑھ کر آنکھیں نم ہوجاتی ہیں- یہاں اس ''آپ بیتی'' سے ایک تفصیلی اقتباس دیا جارہا ہے، جس سے ''الفقیہ'' کے بند ہونے اور پھر نہایت کسمپرسی اور بے سروسامانی میں پاکستان سے اس کی دوبارہ اشاعت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے:

> ''الفقیہ کا علمی سرمایہ ایک عالی شان کتب خانہ تھا جو کامل ۴۵ر برس سے ایک مطمئن سلطنت کے خزانے کی طرح ترقی کر رہا تھا، اس میں مطبوعہ و غیر مطبوعہ نوادر کا ایک ایک ورق پوری توجہ سے محفوظ رکھا جاتا تھا- فنونِ علم کے لحاظ سے وہ کئی شعبوں پر مشتمل تھا- اس میں طبی،

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) یعنی بریلی سے بھیجے جانے والے مضامین میں 'الفقیہ' کی مجلس ادارت قطع برید یا حذف و اضافہ نہ کرے- فاضل بریلوی کی اسی بات کے جواب میں ایڈیٹر 'الفقیہ' نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا ہے کہ ''دفعہ ہشتم کی قید سے مضامین بریلی آزاد ہیں-''

دینی، ادبی، سیاسی، معاشرتی کتب، رسائل اوراخبارات اردو، فارسی ،عربی، انگریزی وغیرہ زبانوں کے ایسے ذخیرے فراہم کیے گئے تھے جو آج کسی قیمت اور کسی کوشش سے حاصل نہیں کیے جاسکتے - میری باقی تمام ذاتی غیر منقولہ اور منقولہ جائیداد کا اندازہ ایک لاکھ روپے لگایا گیا ہے- کتب خانہ اس کے علاوہ ہے- ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میں کسی بھی وقت مالی ضرورتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا - میرا یہ اندوختہ جسے میں اپنی پیری کا سہارا اور اپنی اولاد کی ضروریات کا متکفل سمجھے ہوئے تھا، ایسے وقت میں مجھ سے الگ کرلیا گیا، جب کہ میری کمانے کی صلاحیتیں مضمحل ہوچکی ہیں —— —— ان تمام عظیم نقصانات اور انقلابی حوادث پر صبر کرسکتا، اگر میرا علمی ذخیرہ تباہ نہ ہوتا اور ''الفقیہ'' کی زندگی کو اتنا سخت دھکا نہ لگتا-

الفقیہ : میری زندگی الفقیہ کے لیے وقف تھی- الفقیہ پورے برعظیم میں اپنی طرز کا تنہا حنفی اخبار تھا- میں اس کے بغیر اپنے آپ کو زندہ درگور سمجھتا ہوں- چنانچہ میں نے لاہور کے بالکل اجنبی اور قطعاً غیر ہمدرد ماحول میں اس کے دوبارہ اجرا کی ۲/جنوری ۴۸ء بذریعہ درخواست ڈیکلریشن سرگرم کوشش شروع کردی- مجھے قدم قدم پر بیگانگی اور رکاوٹوں سے دو چار ہونا پڑا- ایک فرسودہ عمر، تھکی ہوئی روح، درماندہ جسم، صدمات و مصائب، تباہیوں اور بربادیوں سے لٹی ہوئی ہمت کے ساتھ میں نے ۷/ماہ کی جدو جہد یعنی ۲/جنوری ۴۸ء کو ڈیکلریشن کی درخواست دی، جو آج ۲۰/جولائی ۴۸ء میں اس مرحلے میں پہنچی ہے کہ اپنے دوستوں سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل کررہا ہوں-

کاغذ: کاغذ کے حصول کی راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ اس کے علاوہ ہیں- لاہور اور کراچی میں روزناموں، ماہ ناموں اور ہفتہ وار اخباروں کی روز افزوں تعداد کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کے مالک اتنی جلدی سے ڈیکلریشن اور کاغذ کے مراحل کس طرح طے کر لیتے ہیں- بظاہر تین ذریعے نظر آتے ہیں:

۱- رشوت- ۲- خوشامد- ۳- تعلقات

جائز اور معقول خرید وفروخت کے ذریعے کا تو ذکر ہی نہ کیجیے، کیوں کہ اس کی یہاں کوئی وقعت نہیں- مذکورہ بالا تینوں ذریعے اپنے بس کی بات نہیں- رشوت کے لیے زر نہیں، خوشامد کی خو نہیں، تعلقات کے لیے جس وجاہت کی ضرورت ہے وہ بھی مرحوم وطن میں رہ گئی-

پریس: پریس کے لیے آٹھ ماہ لگا تار دوڑ دھوپ کی، اس کا مختصر نتیجہ یہ ہے کہ گوجرانوالہ میں ایک پریس ملا ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا- یعنی وہ پریس ملا جس کو پریس کہنا پریس کی ہتک ہے-'' (الفقیہ، گوجرانوالہ ص:۲-۳، شمارہ: ۷/اگست ۱۹۴۸ء)

ان تمام مشکلات ومصائب سے گزر کر پاکستان میں دوبارہ ''الفقیہ'' کی اشاعت شروع ہوئی- ''الفقیہ'' کے اس دوسرے دور میں مولانا ابو یوسف محمد شریف محدث کوٹلوی اس کے سرپرست تھے اور مولانا سید محمود احمد قادری نائب ناظم انجمن حزب الاحناف لاہور مدیر معاون- تاہم مدیر الفقیہ مولانا حکیم معراج الدین کی زندگی وفا نہ کر سکی اور وہ ۹/نومبر ۱۹۴۸ء کو وصال فرما گئے- ان کے وصال کی خبر اور تعزیتی تحریروں اور خطوط پر مشتمل نومبر ۴۸ء میں ہی جو شمارہ نکلا، اس میں ان کے صاحب زادے فیاض الدین احمد نے ''الفقیہ'' کو مسلسل جاری رکھنے کا اعلان کیا- اعلان کے مطابق ۷/اپریل ۱۹۴۹ء سے اخبار نکلنا شروع ہو گیا، مگر اب ''الفقیہ'' کا نہ وہ تیور تھا اور نہ معیار- اس لیے جلدی ہی اس نے آخری سانس لے لی اور صحافت کا ایک زریں باب بند ہو گیا-

(۴)

زیرنظر کتاب میں شامل بحث میں مندرجہ ذیل تین شخصیتوں نے نمایاں حصہ لیا ہے:

۱- پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری

۲- پروفیسر حامد حسن قادری

۳- علامہ ارشد القادری

تینوں اپنے عہد کی اہم علمی شخصیتیں رہی ہیں- ان میں پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری کا تعارفی ذکر ہو چکا ہے- اس لیے یہاں مؤخر الذکر دونوں شخصیتوں کا اجمالی تعارف پیش کیا جا رہا ہے-

پروفیسر مولانا حامد حسن قادری:

پروفیسر مولانا حامد حسن قادری بیسویں صدی کے ایک ممتاز مؤرخ، ادیب، شاعر، تاریخ گو اور مترجم تھے- آپ ۲۵/مارچ ۱۸۸۷ء کو قصبہ بچھرایوں ضلع مرادآباد صوبہ اتر پردیش کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں علم و ادب، شعر و سخن اور مذہب و تصوف کا چرچا رہا- آپ کے پردادا حضرت شیخ مقبول عالم کا سلسلۂ نسب اٹھارہ واسطوں سے حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر سے جا ملتا ہے-

والد مولوی احمد حسن ممتاز جید عالم دین اور شاعر تھے اور چچا مولوی محمد محسن فاروقی اسلامیہ کالج پشاور میں صدر شعبۂ عربی رہے- اس لیے پروفیسر حامد حسن قادری کی نشو و نما خالص علمی، ادبی اور مذہبی ماحول میں ہوئی- آپ کو بیعت و ارادت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری سے تھی-

پروفیسر حامد حسن کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، کتب درسیہ اور عربی و فارسی کی تحصیل کے لیے مدرسہ عالیہ رام پور میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۰۹ء میں اسٹیٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا- ۱۹۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور ۱۹۱۱ء میں اردو فاضل کے امتحانات میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے- فراغت کے بعد تعلیم و تعلم سے فطری لگاؤ کی وجہ سے شعبۂ تدریس کو اپنایا- ۱۹۱۰ء میں آپ کا تقرر بحیثیت معلم اردو و فارسی ریزیڈنسی ہائی

اسکول اودھ میں ہوا، اس کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ اور حلیم مسلم ہائی اسکول کان پور سے وابستہ رہے۔ ۱۹۲۷ء میں بحیثیت صدر شعبۂ اردو و فارسی سینٹ جانس کالج آگرہ میں آپ کا تقرر ہوا اور اسی منصب پر ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی ہجرت کر گئے اور وہیں اپنی علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی آپ معاصر علمی و ادبی رسائل و جرائد میں مضامین لکھتے اور علمی و ادبی بحثوں میں حصہ لیتے رہے۔ یہ سلسلہ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک رکھا۔ آپ نے مختلف موضوعات پر اچھا خاصا تحریری سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔ آپ کی سب سے اہم تصنیف ''داستان تاریخ اردو'' ہے، جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہو کر بے حد مقبول ہوئی۔ علمی و ادبی حلقے میں اسے درجۂ استناد حاصل ہے۔ ''باقیات حامد حسن'' کے مرتب لکھتے ہیں:

> ''تحقیق میں ان کے جس کارنامے کو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہ 'داستان تاریخ اردو' (۱۹۴۱ء) ہے۔ جس کی مقبولیت کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے اردو زبان و ادب کی تاریخ پر ایسے شرح و بسط اور تفصیل سے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔''
>
> (باقیات حامد حسن قادری، ص:۸)

دیگر ادبی تصانیف میں ''تاریخ و تنقید'' اور ''نقد و نظر'' بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ نے اپنی تخلیقی زندگی کی ابتدا شعر و سخن سے کی، امیر مینائی کے شاگرد منشی امتیاز احمد خاں سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔ آگے چل کر اس میدان میں بھی آپ نے خوب جوہر دکھائے۔ اس حوالے سے متعدد مجموعہ ہائے کلام، مثلاً ''مرأۃ سخن''، ''گل صد برگ'' اور ''شور محشر'' منظر عام پر آئے۔ تاریخ گوئی سے بھی آپ کو خصوصی شغف رہا، اس فن میں آپ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کو اردو کے ساتھ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی درک حاصل تھا، اس لیے کئی اہم کتابوں کے ترجمے بھی آپ نے کیے، جو کافی مقبول ہوئے، ان میں اسٹرلنگ نارتھ کی کتاب "ABE Linclon log:Cabin to White House" کا ترجمہ

''ابراہم لنکن: جھونپڑی سے ایوان صدر تک'' اور رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب "Gardner" کا ترجمہ ''باغبان'' بہت اہم ہیں-

۶/جون ۱۹۶۴ء کو آپ کا وصال ہوا-آپ کے وصال کے بعد سندھ یونیورسٹی پاکستان میں سید نور محمد سرور نے آپ کی حیات و خدمات پر بعنوان ''مولانا حامد حسن قادری: سوانح حیات اور ادبی کارنامے'' پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا، جس کے لیے سید نور کو ۱۹۷۸ء میں ڈگری ایوارڈ ہوئی-

علامہ ارشدالقادری: بیس ویں صدی کے نصف آخر میں متحدہ ہندوستان کے اندر جو مشاہیر علما اور مذہبی قائدین گزرے ہیں، ان میں علامہ ارشدالقادری کا نام اپنی بے مثال خدمات کی وجہ سے نمایاں اور ممتاز رہا ہے-علامہ قادری ایک با صلاحیت عالم دین، نکتہ رس خطیب، منجھے ہوئے مدرس، صاحب طرز قلم کار، عالمی مبلغ، مناظر، معمار اور سیاسی مدبر تھے- اپنی ان تمام حیثیتوں کے ساتھ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے غیر معمولی خدمات پیش کیں، جن کا سلسلہ تقریباً چھ دہائیوں پر محیط ہے-

علامہ ارشدالقادری کی ولادت ۱۵/ مارچ ۱۹۲۵ء کو سید پورہ، ضلع بلیا، صوبہ اتر پردیش میں ہوئی-آپ کا گھرانا علم و فضل اور تصوف کے حوالے سے مشہور رہا ہے-آپ کے دادا مولانا شاہ عظیم اللہ جون پور کی شہرۂ آفاق درس گاہ مدرسہ حنفیہ سے فارغ تھے اور اپنے عہد میں فارسی اور علم نحو کے نامور استاذ تھے-آپ کو حضرت سید علی حسین اشرفی میاں، مولانا حامد رضا خاں بریلوی اور مولانا فاخرالہ آبادی سے اجازت و خلافت حاصل تھی-آپ کے والد مولانا شاہ عبداللطیف رشیدی ایک جلیل القدر عالم دین، صاحب حال صوفی اور بزرگ تھے، آپ نے بھی مدرسہ حنفیہ جون پور سے درسیات کی تکمیل فرمائی اور بیعت و ارادت سلسلۂ رشیدیہ میں مولانا شاہ عبدالعلیم بلیاوی ثم آسی غازی پوری سے تھی-آپ کے برادر اکبر مولانا شاہ غلام آسی سلسلۂ ابوالعلائیہ جہانگیریہ کے معروف شیخ طریقت اور نامور عالم دین تھے-آپ ایک عرصے تک مدرسہ اسلامیہ ناگ پور میں شیخ الحدیث رہے-

علامہ قادری کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، اس کے بعد فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے

دادا مولانا عظیم اللہ سے حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ عرصے جامعہ منظر اسلام بریلی میں رہے،اس کے بعد حافظ ملت مولانا عبدالعزیز کی زیرنگرانی مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور (الجامعۃ الاشرفیہ) میں ۸؍سال رہ کر درسیات کی تکمیل کی اور ۱۹۴۴ء میں فارغ ہوئے-صدرالشریعہ مولانا امجد علی اعظمی (مصنف بہار شریعت) سے بیعت وارادت تھی اور خلافت واجازت مولانا ضیاء الدین مدنی اور سرکار پٹنہ مولانا شاہ فدا حسین سے حاصل تھی-

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کا تقرر مدرسہ شمس العلوم ناگ پور میں صدرالمدرسین کی حیثیت سے ہوا-وہاں آپ نے اُن طلبہ کے لیے ایک ''شبینہ مدرسہ'' بھی قائم کیا جو دن میں مزدوری کرتے تھے اور رات میں حصول علم دین کی خواہش رکھتے تھے-انہی طلبہ میں مفتی جلال الدین احمد امجدی بھی تھے، جو دن میں مزدوری کرتے تھے اور رات میں علامہ قادری سے علوم دینیہ حاصل کرتے تھے-علامہ قادری ۱۹۵۱ء تک یہاں تدریسی فریضہ انجام دینے کے بعد اپنے استاذ کے حکم سے ۱۹۵۲ء میں جمشید پور آ گئے اور ''جامعہ فیض العلوم'' کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی، جو آگے چل کر صوبۂ بہار، بنگال، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کا سب سے بڑا دینی ادارہ اور مرکز قرار پایا-یہاں سے اب تک ہزاروں طلبہ فراغت پا کر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں دعوتی وتبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں-جامعہ فیض العلوم کے قیام کے بعد آپ نے ہندوستان کے طول وعرض میں درجنوں ادارے قائم کیے، جن میں اسلامی مرکز، رانچی (صوبہ جھارکھنڈ) دارالعلوم مخدومیہ، گوہاٹی (صوبہ آسام) جامعہ حضرت بلال، بنگلور (صوبہ کرناٹک) جامعہ حضرت نظام الدین اولیا، دہلی (دہلی) دارالعلوم ضیاء الاسلام، ہوڑہ (صوبہ بنگال) مدرسہ مفتاح العلوم، راول کیلا (صوبہ اڑیسہ) اور دارالعلوم رشیدیہ رضویہ، بلیا (صوبہ اتر پردیش) خاص طور پر قابل ذکر ہیں-یوں ہی درجنوں مساجد کی بھی آپ نے بنیاد ڈالی-

ہندوستان کے مسلمانوں کے شرعی مسائل کے حل اور معاشرتی حقوق کی بازیافت کے لیے علامہ قادری نے ۱۹۶۸ء میں پٹنہ صوبہ بہار میں ''ادارۂ شرعیہ'' کی بنیاد ڈالی-رفتہ رفتہ اس کی شاخیں ہندوستان کے اکثر صوبوں میں قائم ہو گئیں—— آپ نے ۱۹۸۱ء میں

دارالعلوم امجدیہ کراچی پاکستان کے اندر وہاں کے علما کو اعتماد میں لے کر ایک دعوتی وتبلیغی تحریک بنام ''دعوت اسلامی'' کی بنیاد ڈالی، اس کا دستور العمل مرتب کیا اور اس کا امیر مولانا محمد الیاس عطار قادری کو نامزد کیا تا کہ یہ تحریک عوامی سطح پر سیدھے سادے انداز میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے کر لوگوں کو سواد اعظم اہل سنت و جماعت پر قائم رکھے- اس وقت دعوت اسلامی اپنے ۳۰ سے زائد فعال شعبوں کے ساتھ دنیا کے تقریباً ۸۰ رملکوں میں کام کر رہی ہے—— ۱۹۸۵ء میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے شاہ بانو کیس میں مسلم پرسنل لا کے خلاف فیصلہ دیا تو مسلمانوں میں ملک گیر سطح پر بے چینی پھیل گئی، اس موقع پر علامہ قادری نے ایک کل ہند تنظیم بنام ''کل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس'' کی تشکیل دی اور پورے ملک میں بڑی بڑی کانفرنسیز اور احتجاجی اجتماعات کر کے حکومت کا سکون غارت کر دیا، آخر اس تنظیم نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی—— ان تنظیموں اور تحریکوں کے علاوہ مسلم متحدہ محاذ (رائے پور) شرعی بورڈ (مبارک پور) الانصار ٹرسٹ (بنارس) سورینام مسلم پولیٹکل کاؤنسل (ساؤتھ امریکہ) قابل ذکر ہیں، جن کے ذریعے آپ نے ملک وملت کے لیے کافی کام کیے- آپ کی دینی، دعوتی اور ملی سرگرمیوں اور مسلمانان ہند پر گہرے اثرات کی وجہ سے آپ کو متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں-

ہندوستان کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی علامہ ارشدالقادری نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں- اس سلسلے میں آپ نے علامہ شاہ احمد نورانی کے ساتھ ۱۹۷۲ء میں مکہ مکرمہ میں ''ورلڈ اسلامک مشن'' کی بنیاد رکھی اور اس کا ہیڈ آفس بریڈفورڈ (انگلینڈ) کو بنایا اور ہند و پاک کے نامور علما کے وفد کے ساتھ مختلف مغربی ممالک کا دورہ کیا، جس کے نتیجے میں کئی مدارس، مساجد اور تنظیمیں وجود میں آئیں- خاص طور پر بریڈفورڈ میں ایک چرچ خرید کر اسے ''اسلامک مشنری کالج'' اور مسجد میں تبدیل کر دیا گیا- کچھ برسوں کے بعد ایمسٹرڈم (ہالینڈ) میں علامہ قادری نے ''جامعہ مدینۃ الاسلام'' قائم کیا، ۱۹۸۸ء میں اس ادارے سے حفاظ کی پہلی جماعت فارغ ہوئی- اسی طرح سرینام (ساؤتھ امریکہ) میں آپ نے ''دارالعلوم علیمیہ'' قائم فرمایا-

علامہ قادری نے ملک و بیرون ملک مختلف اداروں، مسجدوں اور تنظیموں کے قیام کے ساتھ تاریخی اہمیت کی حامل ملکی اور بین الاقوامی سطح کی متعدد کانفرنسیں بھی منعقد کیں، جن کے انعقاد کا مقصد امت مسلمہ کی بیداری، مسلمانوں کے حقوق کی بازیافت یا کسی پائیدار تحریک کی بنیاد رہا- ان میں حسب ذیل کانفرنسیز قابل ذکر ہیں:

کشمیر کانفرنس، جمشید پور (۱۹۶۵ء) صوبائی سنی کانفرنس، سیوان (۱۹۶۸ء) مسلم ویلفیر کانفرنس، جمشید پور، کل ہندسنی اوقاف کانفرنس، دہلی، حجاز کانفرنس، لندن، کل ہند مسلم پرسنل لا کانفرنس، سیوان (۱۹۸۵ء) کل ہندسنی کانفرنس، دہلی (۱۹۹۵ء)

ان کانفرنسوں کے علاوہ بحیثیت مندوب جن ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں آپ نے شرکت کی، ان میں اہم یہ ہیں: کلچرل کانفرنس (ایران) اسلامی عالمی کانفرنس (لیبیا) امام احمد رضا کانفرنس (پاکستان) مولانا عبدالعلیم کانفرنس (ہالینڈ) عالمی اسلامی کانفرنس (عراق) سنی جمعیۃ العلما کانفرنس (کان پور) کل ہند تعلیمی کانفرنس (مبارک پور) عالمی مفتی اعظم کانفرنس (ممبئ) عالمی میلاد کانفرنس (پاکستان)

اپنی تمام تر دعوتی، دینی، تحریکی، تنظیمی، تبلیغی اور سیاسی مصروفیات کے باوجود آپ نے درجنوں کتابیں تصنیف و تالیف کیں، جن میں بعض کتابیں بین الاقوامی سطح پر مشہور ہوئیں اور ان کے ترجمے متعدد زبانوں میں ہوئے- آپ کی تصنیف اور تالیف کردہ کتابوں کی اجمالی فہرست حسب ذیل ہے: زلزلہ، زیر و زبر، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، مصباح القرآن (تین حصے) لسان الفردوس (تین حصے) انوار احمدی، رسالت محمدی کا عقلی ثبوت، سرکار کا جسم بے سایہ، محمد رسول اللہ قرآن میں، دل کی مراد، دور حاضر میں منکرین رسالت کے مختلف گروہ، جلوۂ حق، شریعت، نقش کربلا، فن تفسیر میں امام احمد رضا کا مقام امتیاز، ایک سفر دہلی سے سہارن پور تک، لالہ زار، تعزیرات قلم، دعوت انصاف، فغان درویش، تجلیات رضا، شخصیات، اظہار عقیدت، عینی مشاہدات، بزبان حکایت، خطبات استقبالیہ، حدیث، فقہ اور جہاد کی شرعی حیثیت-

مذہبی صحافت میں بھی آپ نے تاریخ رقم کی اور اپنی فکر اور قلم کا لوہا منوایا- آپ نے

اپنی زندگی میں متعدد رسائل جاری کیے، جن میں جام کوثر، جام نور، شان ملت اور رفاقت نمایاں ہیں- ان میں اول الذکر دو رسائل کی براہ راست آپ نے ادارت و نگرانی کی، جب کہ مؤخر الذکر دونوں رسائل کی سرپرستی کرتے رہے —— دین حق کی سربلندی کے لیے آپ نے مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں سے درجنوں مناظرے بھی کیے- (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سوغات رضا، مطبوعہ رضا اکیڈمی، ممبئی)

آپ کا وصال ۲۹/اپریل ۲۰۰۲ء کو نئی دہلی میں ہوا اور تدفین آپ کے قائم کردہ ادارے جامعہ فیض العلوم، جمشید پور (صوبہ جھارکھنڈ) میں عمل میں آئی- ❑❑❑

سرسید کے مذہبی عقائد وافکار
ایک مکالمہ

فرمان مبارک☆

[مسلم لیگ شرعی حیثیت سے]

پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری

خدا تعالیٰ نے بیسیوں جگہ قرآن شریف میں اپنے بندوں کو متفق ہونے کی تلقین فرمائی ہے-فقیر اخباروں میں ان آیات شریفوں کو اس نیت سے نہیں لکھتا کہ لوگ اخباروں کو پڑھ کر پھینک دیتے ہیں، کلام الٰہی کی بے ادبی ہوتی ہے، اس واسطے ترجمے پر اکتفا کرتا ہوں-
چوتھا پارہ، پہلا ربع، دوسرا رکوع، دوسری آیت شریف-

''اے ایمان دارو! اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی رسی کو مضبوط کر کے پکڑ لو اور آپس میں سب متفق ہو جاؤ-''(۱)

دوسری آیت شریف:

''جتنے مومن ہیں سب آپس میں بھائی بھائی ہیں-''(۲)

جیسے تمہارے جسمانی رشتہ بھائی بھائی ہونے کا ہے- اسی طرح روحانی رشتہ کئی درجے جسمانی رشتے سے بڑھ کر ارفع و اعلیٰ ہے-

تیسری جگہ فرماتے ہیں:

☆ یہ فرمان ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے شمارہ ۲۱/تا ۲۸/جنوری ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا-

(۱) واعْتَصِموْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمیْعاً وّلا تفرّقُوْا (آل عمران:۱۰۳)

(۲) اِنَّمَا الْمُؤمِنُونَ اِخْوَة (حجرات:۱۰)

اٹھائیسواں پارہ، تیسرے رکوع کی آخری آیت:

''کسی قوم کو نہیں پاؤ گے کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول کے ساتھ محبت رکھیں، پھر محبت رکھیں اس شخص کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اور اس کے حبیب حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے پھرا ہوا ہو۔ اگر چہ ان کے باپ ہوں، بیٹے ہوں، بھائی ہوں یا برادری کے آدمی ہوں۔'' (۱)

چوتھی جگہ فرماتے ہیں:

چھٹا پارہ، دوسرا ربع، چوتھا رکوع:

''جو کافروں کے ساتھ محبت رکھے گا وہ بھی کافر ہے۔'' (۲)

اب فقیر چند احادیث لکھتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

''تم بڑے گروہ کی تابعداری کرو، جو بڑے گروہ کو چھوڑ کر الگ ہوگا، وہ جہنم میں پھینکا جائے گا۔'' (۳)

دوسری حدیث:

''جو بڑی جماعت اہل اسلام کو چھوڑ کر بالشت بھر بھی الگ ہوگا، اس نے اپنی گردن اسلام کی رسی سے نکال لی۔'' (۴)

---

(۱) لَا تَجِدُ قَوْماً يُؤمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَادُّوْنَ مَنْ حَادَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ اَوْ اَبْنَآءَ هُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (المجادلہ:۲۲)

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (مائدہ:۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ انہی میں سے ہے۔

(۳) اتبعوا السواد الأعظم من شذ شذ فی النار (المستدرک للحاکم: حدیث نمبر ۳۶۱)

(۴) من خرج من الجماعة قید شبر فقد خلع ربقة الاسلام من رأسه الا ان یرجع (المستدرک للحاکم: کتاب العلم/حدیث نمبر ۴۱۲)

یعنی وہ مسلمان ہی نہ رہا۔

تیسری حدیث شریف:

''اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ہاتھ جماعت کے اوپر ہے''(۱)

چوتھی حدیث شریف:

''جو بکری ریوڑ کے اندر ہے، اس کو بھیڑیا نہیں پکڑ سکتا اور جو بکری ریوڑ کو چھوڑ کر الگ ہوجائے، اس کو بھیڑیا شکار کر لیتا ہے۔''(۲)

پھر فرمایا:

''جو بڑی جماعت کو چھوڑ کر علیحدہ ہوگا، وہی شیطان کا شکار ہوگا۔'' (۳)

باقی قائداعظم محمد علی جناح صاحب کی ذات پر جو حملے کر رہے ہیں، ان کو گالیاں نکالنا اپنا شیوہ مقرر کیا ہوا ہے۔ قوم نے جناح صاحب کو مفتی نہیں بنایا، قاضی نہیں بنایا، خطیب نہیں بنایا، امام نہیں بنایا۔ پھر کیا بنایا ہے؟ ان کو اپنا لیڈر مقرر کیا ہے۔ ہمارے ضلع میں ایک بیرسٹر ہے۔ فوجداری مقدمات میں سارے ضلع میں ہر ایک مسلمان اسی کو اپنا وکیل بناتا ہے۔ کبھی کسی نے نہیں پوچھا کہ تم کو نماز بھی آتی ہے کہ نہیں، حالاں کہ وہ ہندو ہے اور قوم کا برہمن ہے۔

مجھے ایک بات یاد آ گئی، ۶۵/ برس کا واقعہ ہے کہ جب فقیر لاہور میں پڑھا کرتا تھا تو

---

(۱) يد الله مع الجماعة (جامع ترمذی: حدیث نمبر ۲۰۹۴)
يد الله على الجماعة (مجمع الزوائد للہیثمی: ج ۵/ص ۲۲۸)

(۲) ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم يأخذ الشاة القاصية والناحية فاياكم والشعاب وعليكم بالجماعة (الجامع الصغیر للسیوطی: حدیث نمبر ۲۰۲۲)

ترجمہ: شیطان انسان کے لیے بھیڑیے کی مانند ہے جیسا کہ بکریوں کے لیے بھیڑیا ہوتا ہے، وہ ہر اس بکری کو پکڑ لیتا ہے جو ادھر ادھر بھٹک جائے تو (اے مسلمانوں!) خبردار وادیوں میں مت بھٹک جانا، جماعت کو لازم پکڑو۔

(۳) حدیث کا متن اس طرح ہے: ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم يأخذ الشاة القاصية والناحية فاياكم والشعاب وعليكم بالجماعة (الجامع الصغیر للسیوطی: حدیث نمبر ۲۰۲۲)
مضمون نگار نے اسی حدیث کا مفہوم لکھا ہے۔

سرسید صاحب رحمۃ اللہ علیہ علی گڑھی لاہور میں تشریف لائے، فقیر بھی ان کا لیکچر سننے کے لیے گیا۔ انہوں نے اپنے لیکچر میں یہ بیان کیا کہ:

''لوگ جب مسجد بنواتے ہیں تو چوہڑے چمار، بھنگی کوٹوکری اٹھانے کے لیے لگا لیتے ہیں، ایسے ہی مجھ کو چوہڑا سمجھو، چمار سمجھو، کافر سمجھو، تم اپنی مسجد بنوالو۔ میری ذات سے تمہیں کیا غرض، میں مسجد تمہاری بنا رہا ہوں۔''

دوسرا واقعہ: مسجد شہید گنج کے وقت فقیر لاہور میں تقریر کر رہا تھا اور سارے ہندوستان کے نیوفیشن، واولڈ فیشن ادنیٰ سے اعلیٰ تک سب اس جلسے میں جمع تھے اور فقیر نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ قومی ہمدردی کا سہرا سرسید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سر پر ہے۔ فقیر نے اس سے پہلا زمانہ بھی دیکھا اور پچھلا بھی۔ تقریر ختم کرنے کے بعد تین مولوی صاحبان میرے گرد ہو گئے اور کہا کہ آپ نے سرسید صاحب کی ''تہذیب الاخلاق'' نہیں پڑھی؟ فقیر نے کہا کہ ''تہذیب الاخلاق'' تو نہیں پڑھی، مگر ان کے دو شعر مجھ کو یاد آ گئے، وہ آپ کو سنا دیتا ہوں۔ جب یہ شعر سنائے تو تینوں مولوی صاحب ایسے دم بخود ہوئے کہ ان میں سانس ہی نہیں تھا۔

شعر اول:

دل و جانم فدایت یا محمد
سرمن خاک پایت یا محمد

دوسرا شعر:

خدا دارم دل بریاں زعشق مصطفیٰ دارم
نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

''آثار صنادید'' میں سرسید صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں حضرت شاہ غلام علی صاحب نقش بندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہوں۔ (۱)

(۱) حضرت عبداللہ عرف شاہ غلام علی دہلوی نقش بندی مجددی، ایک عارف حق، صوفی کامل **(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)**

الراقم
سید جماعت علی شاہ عفاءاللہ عنہ
از:علی پور سیداں،ضلع سیالکوٹ

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) علوم ظاہر و باطن کے جامع، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مرید وخلیفہ اور جانشین تھے-آپ کی ولادت ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء میں بٹالہ یا پٹیالہ پنجاب میں ہوئی-آپ کا تعلق سادات علوی سے تھا-۱۱۷۸ھ میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے بیعت ہوئے اور اپنے مرشد کی تربیت میں مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعے عروج کمال حاصل کیا- سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

''علم اور عمل اور فضل و کمال اور تجرید اور تجرّد اور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور ایثار و انکسار آپ کی ذات پر ختم تھے-'' (آثار الصنادید، جلد:اول،ص:۱۵)

آپ نے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی، لیکن اذکار و اشغال طریقۂ نقش بندیہ مجددیہ میں جاری کیا اور اپنے مرشد کے وصال کے بعد ان کے جانشین ہوئے-عہد عالم گیری کے بعد سلسلہ نقش بندیہ کو آپ نے وہ کمال عطا کیا کہ بقول شیخ محمد اکرام:

''سلسلے کو نئی زندگی شاہ غلام علی سے ملی——ان کی بدولت سلسلے میں بار دگر درویشی کو فروغ ہوا، بلکہ سلسلے نے ایک نئی صورت اختیار کی-'' (رود کوثر،ص:۶۵۹)

تیرہویں صدی ہجری کے ربع اول میں آپ کی خانقاہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، جہاں معرفت و طریقت اور سلوک و مجاہدے کی تعلیم و تربیت کے ساتھ علم حدیث، تفسیر اور فقہ کے درس دیے جاتے تھے اور ملک و بیرون ملک سے متلاشیان معرفت حق ٹوٹے پڑتے تھے-سرسید نے ذکر کیا ہے:

''آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے آن کے بیعت اختیار کی-میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہوکر بیعت کی اور خدمت خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے-''

(آثار الصنادید، جلد:اول،ص:۱۷)

آپ کا وصال ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں ہوا اور اپنے مرشد کے پہلو میں دفن ہوئے-نوّر الله مضجعه سے تاریخ وفات نکلتی ہے-(تذکرۂ علمائے ہند،ص:۳۶۴)

بریلوی علمائے کرام جواب دیں!☆

''الفقیہ'' جو بریلوی عقائد کا ہندوستان بھر میں واحد آرگن ہے- اس کی ۲۱رتا۲۸ر جنوری ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں بعنوان ''فرمان مبارک'' ہندوستان کی اعلیٰ ہستی کے قلم مبارک سے شائع ہوا ہے، جس میں سرسید احمد علی گڑھی کے نام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' درج ہوا- دیکھ کر ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی- کیا سرسید نے اپنی ''تفسیر القرآن'' میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی ہستی کا انکار نہیں کیا؟ کیا اس نے وحی الٰہی کو نہیں جھٹلایا؟ اور بے شمار ایسی باتیں نہیں لکھیں، جن سے کفر لازم آتا ہے؟ صرف دو شعر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں پڑھ دینے سے وہ کفر سے بری ہوسکتا ہے تو اس طرح میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر عیسائی اور ہندو وسکھ حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں بہت سے اشعار اور مضامین پڑھتے رہتے ہیں- کیا ان کو بھی مسلمان مان لیا جائے گا؟ حضرات علمائے کرام بغیر کسی رو رعایت کے اس مضمون پر کافی روشنی ڈال کر ہماری رہنمائی فرمائیں- کاٹھیاواڑ بمبئی میں اس مضمون سے بے حد انتشار پیدا ہو رہا ہے-

احقر

سلامت اللہ ولی بھائی

از: دھوراجی، کاٹھیاواڑ

☆ مولانا پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری کے مضمون ''فرمان مبارک: مسلم لیگ شرعی حیثیت سے'' کے تعلق سے یہ مراسلہ ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے شمارہ ۲۱رتا۲۸ر فروری ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا-

اُذْکُرُوا امْوتَاکُم بالْخَیرُ☆

پروفیسر حامد حسن قادری
استاذ: سینٹ جانس کالج، آگرہ

۲۱ر تا ۲۸ر فروری کے ''الفقیہ'' میں کسی کاٹھیاواڑی صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے، جس کا عنوان ہے ''بریلوی علمائے کرام جواب دیں۔'' اس مضمون میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ۲۱ تا ۲۸ر جنوری کے ''الفقیہ'' میں جو ''فرمان مبارک'' اعلیٰ حضرت، قبلہ عالم، امیر ملت محدث علی پوری دامت برکاتہم کے قلم مبارک سے شائع ہوا ہے۔ اس میں حضور قبلہ عالم اروا حنا فداهم نے سرسید احمد صاحب علی گڑھی کے نام کے ساتھ ہر جگہ ''رحمۃ اللہ علیہ'' کیوں تحریر فرمایا ہے؟ سرسید صاحب کو خیر و نیکی کے ساتھ یاد کرنے پر کاٹھیاواڑی مضمون نگار بہت برہم و برافروختہ ہیں۔ میں اس کا جواب مختلف پہلوؤں سے پیش کرتا ہوں:

حضرت قبلہ عالم دامت فیوضہم نے فرمان مبارک میں تحریر فرمایا ہے کہ جب حضرت نے سرسید صاحب کو ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہا تو تقریر ختم ہونے پر اسی جلسے میں تین مولوی صاحبان حضرت کے گرد ہو گئے کہ آپ نے سرسید کے نام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' کیوں فرمایا ہے اور کہا کہ آپ نے سرسید صاحب کی ''تہذیب الاخلاق'' نہیں پڑھی؟ حضرت قبلہ عالم مدظلہم نے فرمایا کہ ''تہذیب الاخلاق'' تو نہیں پڑھی، مگر ان کے دو شعر مجھ کو یاد آ گئے وہ

☆ سلامت اللہ ولی بھائی کے مراسلے بعنوان ''بریلوی علمائے کرام جواب دیں'' کے جواب میں پروفیسر حامد حسن قادری کا یہ مضمون ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے شمارہ ۲۱ر تا ۲۸ر مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔

آپ کو سناتا ہوں- جب یہ شعر سنائے تو تینوں مولوی صاحب ایسے دم بخود ہوئے کہ ان میں سانس ہی نہیں تھا- شعر اول یہ تھا:

دل و جانم فدایت یا محمد
سرمن خاک پایت یا محمد

دوسرا شعر:

خدادارم دل بریاں زعشق مصطفیٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

اب کاٹھیاواڑی صاحب سے یہ عرض ہے کہ اس جلسے کے تین مولوی صاحبان کو سرسید احمد صاحب کے یہ دو شعر سن کر اطمینان ہو گیا اور وہ قائل ہو گئے کہ ان اشعار کا کہنے والا بے شک مومن ہے اور اس کے نام کے ساتھ ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہا جا سکتا ہے تو پھر کاٹھیاواڑی صاحب کیوں نہیں مانتے اور کیوں قائل نہیں ہوتے؟ ان مولوی صاحبان کا خاموش اور دم بخود ہو جانا یہی معنی رکھتا ہے- اگر ان کو اطمینان نہ ہوتا تو وہ حضرت قبلہ عالم دامت برکاتہم سے ضرور کہتے کہ یہ دلیل کافی نہیں ہے، جب وہ مولوی صاحب مان گئے تو آپ کیوں نہ مانیں؟ آپ علمائے کرام سے جواب مانگتے ہیں- وہ مولوی صاحبان علمائے کرام ہی میں سے تھے- علمائے کرام کا جواب آپ کو وہیں مل گیا- (۱)

دوسرا پہلو یہ ہے کہ سرسید احمد صاحب کے دوسرے شعر میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے- انہوں نے یہ شعر اس وقت کہا ہے، جب ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے ہیں- وہ اپنے کافر گروہ کو جواب دیتے ہیں کہ میں خدا رکھتا ہوں اور حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ

---

(۱) یہاں ایڈیٹر ''الفقیہ'' امرتسر نے مندرجہ ذیل حاشیہ لکھا ہے:

''ان تین مولوی صاحبان کو ہم جانتے ہیں- ایک ان میں سے مراد آباد کے اور دو لاہور کے بڑے مولوی صاحبان ہیں- وہ حضرات اس وقت خاموشی سے کام لے رہے ہیں- ان کو چاہیے کہ وہ جلد از جلد اس کا جواب دیں تاکہ ان کی طرح ان لوگوں کو تسلی بھی ہو جائے اور وہ خاموش ہو جائیں، ورنہ ہم آئندہ اشاعت میں ان ہر سہ حضرات کے نام نامی شائع کر دیں گے- (ابوالریاض)''

وسلم کی آتش محبت اپنے دل کے اندر رکھتا ہوں- اس پر بھی تم مجھے کافر کہتے ہو؟ کافر کے پاس تو یہ ساز وسامان نہیں ہوتا جو میرے پاس ہے- کافر تو خدا و مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہیں کرتا- اس میں نکتہ یہ ہے کہ سرسید صاحب اپنے اسلام و ایمان میں شک کرنے والوں کو یہ جواب دیتے ہیں اور صرف اقرار توحید و رسالت نہیں کرتے، بلکہ اس سے بڑھ کر عشق و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں- اب غور فرمایئے کہ کوئی مسلمان اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہے- کسی کے ایمان کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوسکتا ہے؟

تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت امیر ملت قبلہ عالم دامت برکاتہم نے اپنے فرمان مبارک میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''آثارالصنادید میں سرسید صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں حضرت شاہ غلام علی صاحب نقش بندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہوں-''(۱)

اس کی تصدیق سرسید صاحب کے ایک شعر سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے حضرت شاہ غلام علی صاحب قدس سرہٗ کی تعریف میں لکھا ہے اور جس کو مولانا حالیؔ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے سید صاحب کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' میں نقل کیا ہے-

شعر یہ ہے:

---

(۱) تلاش بسیار کے باوجود ''آثارالصنادید'' میں یہ نہیں مل سکا کہ سرسید احمد خاں حضرت شاہ غلام علی کے مرید تھے- البتہ یہ صراحت مذکور ہے کہ سرسید کے والد اور ان کے بڑے بھائی شاہ صاحب سے بیعت تھے- شاہ صاحب سے اپنے اور اپنے خاندان کے گہرے روابط و تعلقات کا ذکر کرنے کے بعد سرسید نے اپنے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے، وہ حسب ذیل ہے:

> ''میں ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور آپ اپنی شفقت اور محبت سے مجھ کو اپنے پاس مصلّے پر بٹھا لیتے اور نہایت شفقت فرماتے- لڑکپن میں کچھ تمیز تو ہوتی نہیں، خصوصاً صغرسن میں، جو چاہتا سو کہتا، جو چاہتا سو کرتا اور حرکات بے تمیزانہ مجھ سے سرزد ہوتیں اور آپ ان سب کو گورا فرماتے- میں نے اپنے دادا کو تو دیکھا نہیں، آپ ہی کو دادا حضرت کہا کرتا تھا-'' (آثارالصنادید، جلد: اول، ص:۱۹)

اسی طرح سرسید کی مستند سوانح ''حیات جاوید'' مؤلفہ مولانا الطاف حسین حالیؔ اور نہ سرسید کی خود نوشت سوانح ''حیات سرسید'' مرتبہ ضیاءالدین لاہوری میں بھی یہ وضاحت نہیں ملتی کہ سرسید شاہ صاحب سے بیعت تھے-

بمکتب رفتم و آموختم اسرار یزدانی
زفیضِ نقش بندِ وقت جانِ جانِ جانانی (۱)

''جان جاناں'' سے مراد حضرت سیدنا مظہر رحمۃ اللہ علیہ (۲) وران کی جان حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ- اس شعر میں سرسید صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شاہ غلام علی صاحب خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہما جو اپنے زمانے

(۱) اس شعر سے بیعت کا کوئی تعلق نہیں ہے- حضرت شاہ غلام علی نے سرسید کو مکتب پڑھایا تھا، بڑے ہونے کے بعد اس لمحے کو یاد کر کے سرسید نے یہ شعر بطور فخر یہ کہا تھا- مولانا الطاف حسین حالؔی سرسید کی زبانی مکتب پڑھائے جانے کے واقعے کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''سرسید نے جب یہ (مکتب پڑھائے جانے کے واقعے کو) ذکر کیا تو بطور فخر کے اپنا یہ فارسی شعر جو خاص اسی موقع کے لیے انھوں نے کبھی کہا تھا، پڑھا-''

(دیکھئے: حیات جاوید: ص: ۴۱/۴۰، نامی پریس کانپور، ۱۹۰۱ء)

(۲) حضرت مرزا مظہر جان جاناں سلسلۂ نقش بندیہ مجددیہ کے نامور مشائخ میں سے تھے- مولوی فقیر محمد جہلمی نے ذکر کیا ہے کہ آپ:

''عالم فضل، محدث کامل، فقیہ متبحر، جامع فضائل ظاہری و باطنی، عابد، زاہد، متورع، متوکل تھے-''

(حدائق الحنفیہ، ص: ۴۵۳)

آپ کے والد مرزا جان مغل حکمراں اورنگ زیب عالم گیر کے منصب دار تھے، ترک منصب کر کے دکن سے اکبر آباد جا رہے تھے کہ مالوہ (کالا باغ) میں ۱۲رمضان ۱۱۱۱ھ/۱۷۰۰ء کو آپ کی ولادت ہوئی- یہ خبر جب اورنگ زیب عالم گیر کو پہنچی تو فرمایا 'پسر جان پدرمی باشد (بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے) اس لیے ہم نے اس کا نام 'جان جاناں' مقرر کیا-'' (تذکرۂ علمائے ہند، ص: ۴۹۵) اسی نام سے آپ کو شہرت ملی- آپ کا لقب شمس الدین تھا اور تخلص مظہرؔ- انیس واسطوں سے آپ کا نسب محمد بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے- مولانا عبدالحی لکھنوی نے ذکر کیا ہے کہ:

آپ کی دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں، پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں، ان رشتوں سے (آپ) تیموری خاندان کے نواسے تھے-'' (گل رعنا، ص: ۱۲۵)

آپ نے علمائے وقت سے تحصیل علوم کیا، حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھی اور حضرت سید نور محمد بدایونی (مرید و خلیفہ شیخ سیف الدین، مرید و خلیفہ شیخ محمد معصوم عروۃ الوثقی، مرید و خلیفہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی) سے بیعت ہوئے اور خلافت واجازت پائی- صوفی اور شیخ طریقت ہونے کے ساتھ آپ اردو کے ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے، اس حوالے سے اردو کے تمام معاصر، قدیم اور مستند شعرا کے تذکروں میں آپ کا ذکر ملتا ہے- آپ کے استغنا اور توکل کا یہ عالم تھا کہ اپنی زندگی میں کسی بادشاہ یا حکمراں کے آگے **(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)**

کے قطب وقت ہیں- ان کے فیض سے اسرار یزادانی حاصل کیے-

چوتھا جواب یہ ہے کہ جو حدیث شریف میں نے عنوان میں لکھی ہے اس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ "اپنے مرنے والوں کو خیر کے ساتھ یاد کرو-" (۱) تو جو شخص اس خیر سے روکنے والا ہو اس کی صفت قرآن مجید کے الفاظ میں مَنَّاعٌ لِلْخَيْرِ (۲) ہوئی-

پانچواں جواب یہ ہے کہ اگر سرسید صاحب کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ کہا جاتا تو جلسے والے تینوں مولوی صاحبان کو اور کاٹھیاواڑی صاحب کو کسی قسم کا اعتراض نہ ہوتا- معمولی روزمرہ کی بات سمجھ کر خاموش رہتے- حالاں کہ "مرحوم" اور "رحمۃ اللہ علیہ" (۳) دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے- دونوں دعائیہ کلمے ہیں- دونوں میں مرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی دعا ہے، لہٰذا "رحمۃ اللہ علیہ" کہنے پر اعتراض کا کیا محل ہے؟

چھٹا جواب یہ ہے کہ سرسید صاحب کے لیے "رحمۃ اللہ علیہ" کلمہ اعلیٰ حضرت قبلہ عالم علی پوری ارواحنا فداہم کی زبان مبارک سے نکلا ہے- یہ وہ مقدس و مبارک وجود اور یگانہ و یکتا ہستی ہیں کہ تمام عالم میں، عرب و عجم میں، ہندوستان کے عرض وطول میں، کہیں ان کی

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) سر خم نہیں کیا، پوری زندگی کرایے کے مکان میں گزار دی اور ایک جوڑے سے زیادہ کپڑے نہیں رکھتے تھے- عرس و فاتحہ اور نذر و نیاز کے لیے آپ نے کڑی شرطیں مقرر کر رکھی تھیں- علاقہ روہیل کھنڈ میں کثرت سے آپ کے ارادت مند تھے، جہاں آپ کے اکثر دورے ہوتے- یہ سیاسی ابتری کا زمانہ تھا اور مرہٹوں اور جاٹوں نے طوفان مچا رکھا تھا، آپ نے اپنے عقیدت مند اہالیان روہیل کھنڈ کو ان کے خلاف تیار کیا ،جس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے تھے-

۷ر محرم ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء کو ایک شیعہ فولاد خاں نے آپ کو گولی ماردی اور ۱۰ر محرم ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء کو آپ شہید ہو گئے- "عاش حمیداً مات شہیداً" سے تاریخ وفات نکلتی ہے-

(۱) حدیث کا یہ متن "**اُذْکُرُوا اَمْوَاتَکُم بالْخَیر**" احادیث کی کسی معتبر کتاب میں نہیں ہے- اسی معنی کی دوسری حدیث ابوداؤد اور ترمذی میں ہے، الفاظ یہ ہیں:

اذکروا محاسن موتاکم و کفوا عن مساویھم (اپنے مردوں کے محاسن بیان کرو اور ان کی برائیاں بیان کرنے سے زبان کو روکو) (**جامع الترمذی**: کتاب الجنائز/ باب فی الامر بذکر محاسن الموتیٰ والکف عن مساویھم/ **حدیث نمبر** ۱۰۱۹) (**سنن ابی داؤد**: کتاب الادب/ باب فی الستر علی المسلم/ **حدیث نمبر** ۴۹۰۰)

(۲) بھلائی سے بڑا روکنے والا: القلم: ۱۲

(۳) یہاں ایڈیٹر "الفقیہ" نے حاشیہ لکھا ہے کہ "بالکل درست ہے-"

نظیرنہیں ہے- (ا) یہ کوئی بات بے سوچے سمجھے نہیں کہہ دیتے- ہر کسی کے لیے ہر قسم کی دعا نہیں کر دیتے- یہ مقبول یزدانی اور محبوب سبحانی ہیں، مُنزّ ل البرکات اور مجیب الدعوات ہیں- ان کی زبان مبارک سے جو نکلتا ہے وہی ہو جاتا ہے- انہوں نے سر سید صاحب کو ''رحمۃ اللہ علیہ'' فرمایا ہے- میرا ایمان یہ ہے کہ جس شخص کو یہ اپنی مبارک زبان سے ''رحمۃ اللہ علیہ'' فرمادیں، وہ اگر پہلے اس کا مستحق نہ تھا تو ان کے فرمانے سے ہو گیا-

گفتۂ او گفتہ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

(ا) یہاں ایڈیٹر ''الفقیہ'' نے حاشیہ لکھا ہے کہ ''اس میں ذرا شک کی گنجائش نہیں-'' (ابوالریاض)

مقام حیرت☆

علامہ ارشد القادری

آج ۲۱/ تا ۲۸/ مارچ کے ''الفقیہ'' میں '' اُذکُرُوا مَوْتَاکُم بالْخَیر '' عنوان سے جناب مولوی حامد حسن قادری، پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ کا ایک جوابی مضمون نظر سے گزرا- بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور اب تک میں محو حیرت ہوں کہ فاضل مضمون نگار کا قلم بالاضطرار حرکت کر گیا ہے یا ذہنی ارادہ بھی شریک عمل ہے- بغیر کسی عناد کے نہایت ادب کے ساتھ مخلصانہ گزارش ہے کہ صاحب مضمون اپنی تحریر پر عقیدت و طرف داری سے برطرف ہو کر نظر ثانی فرمائیں- ورنہ کم از کم ایک پروفیسر کی جانب اس مضمون کا انتساب علم و بصیرت کی سخت توہین کا باعث ہو جائے گا-

جواب کا بنیادی اصول:

بنابریں میں فاضل مضمون نگار کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ آیئے ہم اور آپ دونوں مل کر اس مسئلے میں صحیح مسلک تلاش کریں- بہت ممکن ہے ہم دونوں کسی نقطے پر پہنچ کر متفق ہو جائیں- ورنہ ہمیں بہت اندیشہ ہے کہ کہیں یہ مسئلہ فتنہ انگیز اختلاف کا باعث نہ بن جائے اور آپس کی خانہ جنگیاں ہماری ملت کی آہنیں بنیادوں کو متزلزل کر دیں- شریعت اسلامیہ کا یہ اولین دستور اساسی ہے کہ متصف بالایمان کو ''مومن'' کہا جائے اور مرتکب بالکفر کو

☆ پروفیسر حامد حسن قادری، استاذ سینٹ جونس کالج آگرہ کا مضمون '' اُذکُرُوا مَوْتَاکُم بالْخَیر '' کے جواب میں یہ مضمون ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے شمارہ ۷/ تا ۱۴/ جون ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا-

''کافر''- اسی ضابطے کے پیش نظر اگر کوئی مفتی اسلام کسی کلمہ گو انسان کو کافر کہتا ہے تو شریعت فوراً اس کی گرفت کرتی ہے اور سب سے پہلے فتویٰ تکفیر کی وجہ دریافت فرماتی ہے- اگر مفتی اسلام نے تکفیر کی کوئی معقول وجہ بتادی، جب تو اس دن سے ایسا شخص مسلمانوں کی صف سے نکال دیا جاتا ہے اور اگر بغیر کسی سبب تکفیر کے فتویٰ کفر ہے تو پہلی صورت کا بالکل عکس ہوجاتا ہے اور غیروں پر پھینکا ہوا تکفیر کا تیر خود رامی السہم کے حلق کو مجروح کر ڈالتا ہے-

لہٰذا اس آئین محکم کے مدنظر آپ کے نزدیک سر سید احمد کی تکفیر بے محل تھی اور اس پر ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے اطلاق سے روکنا حکم باطل تھا تو سب سے پہلے آپ پر لازم تھا کہ آپ شریعت اسلامیہ کے مسلمہ اصول کی پابندی کرتے ہوئے سر سید احمد کی تکفیر کرنے والے اور اس پر ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے اطلاق سے منع کرنے والے حضرات سے اس کی وجہ دریافت فرماتے- اگر وہ لوگ سبب تکفیر نہ بیان کرتے تو آپ کی صداقت سر سید احمد کے ایمان اور ان لوگوں کی کفر تک پہنچی ہوئی ضلالت کا اعلان ہوجاتا اور اگر وہ لوگ موجبات تکفیر پیش فرمادیتے تو مسئلہ صاف ہوجاتا اور یہ اختلاف کی خلیج اتنی وسیع نہ ہوجاتی-

جوابات سادسہ کی حقیقت:

رہ گئے وہ جوابات جو ''الفقیہ'' کے صفحات پر بھرے پڑے ہیں، سو ان کے متعلق صرف اتنی گزارش ہے کہ اصحاب تحقیق کے نزدیک وہ اس قدر مجروح ہیں کہ ان پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا نقد و بصیرت کی توہین ہے-

حضرت والا! جس موضوع پر آپ بحث فرما رہے ہیں- یہ کوئی تار عنکبوت نہیں ہے جو ایک پھونک میں اڑ جائے گا- یہاں پر کفر و اسلام کی جنگ ہے، مسلمانوں کی جماعت سے خارج کرنے اور اس میں داخل کرنے کا معاملہ ہے، مورد رحمت بنانے اور موجب لعنت بنانے کا سوال ہے اور حق و باطل کے معرکے میں برہان و دلیل کی صف شکن طاقتیں درکار ہیں- آپ کے ان جوابات سادسہ میں کوئی جواب بھی اس قابل نہیں جو سر سید احمد کی تکفیر کے بعد اس کا اسلام ثابت کردے- اس کا تو جواب صرف اتنا ہے کہ اگر آپ کہہ سکتے ہیں تو براہ راست یہ کہہ دیجیے کہ چوں کہ اس کے تمام معتقدات اور کردار میں موجب تکفیر نہیں

پایا جاتا، اس لیے ایک مومن کو کبھی بھی کافر نہیں کہا جا سکتا اور اگر اس کے کفریات کے باوجود آپ اس کو مسلمان، مرحوم، مغفور کہلوانا چاہتے ہیں تو براہ کرم آپ اس کے کفریات سے اس کی توبہ ثابت کر دیجیے - خبر متواتر سے نہ سہی خبر واحد ہی سے اگر یہ معلوم ہو جائے کہ سرسید احمد اپنے کفریات سے توبہ کر کے دنیا سے رخصت ہوا ہے تو سب سے پہلے میں وہ شخص ہوں گا جو اس کی قبر پر فاتحہ پڑھے گا اور اس کے کفریات کی بغیر شرعی صفائی پیش کیے ہوئے اگر آپ صرف الفاظ کے زور سے اس کو مسلمان ثابت کرنا چاہتے ہیں تو معاف کیجیے دنیا میں اور بھی اہل نظر بستے ہیں - اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو آنکھیں کھول کر دیکھئے آپ کے ان جوابات میں کیسی کیسی حیرت انگیز خامیاں ہیں -

غلط فہمی کی عجیب پیداوار:

پہلے جواب میں کاٹھیاواڑی حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اب کاٹھیاواڑی صاحب سے یہ عرض ہے کہ اس جلسے کے تین مولوی صاحبان کو سرسید احمد صاحب کے دو نعتیہ شعر سن کر اطمینان ہو گیا اور وہ قائل ہو گئے کہ ان اشعار کا کہنے والا بے شک مومن ہے اور اس کے نام کے ساتھ '' رحمۃ اللہ علیہ '' کہا جا سکتا ہے تو پھر کاٹھیاواڑی صاحب کیوں نہیں مانتے اور کیوں قائل نہیں ہوتے؟''

پروفیسر صاحب! انصاف کے ساتھ بتائیے، کیا یہ جواب ہو گیا؟ اگر کسی دعوے پر کوئی مجروح سے مجروح دلیل سن کر کسی بنا پر تین اشخاص کا خاموش ہو جانا، یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس پر ایمان لے آئیں - بلکہ دلیل کی حیثیت سے قطع نظر کر کے صرف اس شکست خوردہ خاموشی سے دوسرے بھی مطمئن ہو جائیں تو براہ کرم جناب والا اپنی ذات اقدس کے متعلق کیا فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ لاکھوں شیعوں، ہزاروں قادیانیوں، کروڑوں عیسائیوں اور ہندوؤں نے اپنے اپنے مذہبی دلائل پر اطمینان و اعتماد کر لیا ہے، لیکن ان بے شمار اشخاص کے یقین کے باوجود بھی آپ ان کے مذہبی دلائل پر قطعاً اطمینان نہیں کرتے - دلیل کو اگر آپ معیار بحث اور مدار حق و باطل قرار دیتے تو البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ دشمنان

اسلام کے دلائل باطل ہیں، اس لیے ہمیں اطمینان نہیں ہوتا- لیکن یہاں تو شخصیت کی تعداد پر آپ حق و باطل کا فیصلہ فرما رہے ہیں-

دوسرا پہلو اس جواب کا جو سب سے روشن ہے، وہ یہ ہے کہ سرسید احمد کے نعتیہ اشعار اس کے ایمان و اسلام کو (اس کے کفریات کے باوجود) بانگ دہل ثابت کر رہے ہیں- اس کے متعلق صرف اتنی گزارش ہے کہ اگر علمائے امت کے نزدیک اس کی کفریات ثابت نہیں ہے جب تو اس کے مسلمان ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور اب اس کو مومن اور موجب ''رحمۃ اللہ علیہ'' ثابت کرنے کے لیے اس کے اشعار ثابت کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور اگر اس کے کفری عقائد پایہ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں تو اس کے متعلق آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ملت اسلامیہ کے نزدیک ایک مرتد اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے کفریات سے توبہ کا اعلان کر کے تجدید ایمان نہ کرلے- (دیکھئے کتب عقائد) بغیر توبہ کے چاہے وہ ہزار برس تک گنبد خضرا کے سامنے کھڑے ہوکر ادب کے ساتھ حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھی پڑھتا رہے، جب بھی لسان شریعت اس کو مسلمان کہنے کی اجازت ہرگز نہیں دے گی- بلکہ بدون توبہ ایک کروڑ بار کلمۂ طیبہ بھی پڑھ جائے، اس وقت بھی وہ مسلمان نہیں ہوسکتا- اصول شریعت سے قطع نظر کر کے اگر سرسید احمد کے دو نعتیہ شعر اس کے کفریات کے باوجود اسے مومن بناسکتے ہیں تو ان لاکھوں ہندوؤں، ہزاروں عیسائیوں، کروڑوں دیوبندیوں اور ان تمام بے دینوں نے کیا قصور کیا ہے کہ سیرت کے جلسوں میں ان کی نیازمندانہ تقریریں، اپنے کثیر اشعار میں حضور کے ساتھ عشق و محبت کے تڑپتے ہوئے اظہار جذبات، کتابوں کے بیکراں اوراق پر تاجدار مدینہ سے عقیدت و ارادت کے بکھرے ہوئے جواہر پارے اپنے اپنے متعلقین کو مسلمانوں کی صف میں کیوں نہیں داخل کردیں گے؟ اور اگر آپ کے نزدیک ان کے کفریات کے باوجود مسلمان بنادینے کے لیے اتنا کافی ہے تو بسم اللہ آج ہی اس کا اعلان فرمادیجیے اور اگر نہیں تو سرسید کے کفریات کے باوجود اسے مسلمان کیوں بنائے جارہے ہیں؟ یہ ترجیح بلا مرجح کیوں ہے؟

تیسرے جواب کی نمایاں کمزوری:

تیسرے جواب کے سلسلے میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

''سرسید احمد حضرت شاہ غلام علی صاحب نقش بندی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہے- جیسا کہ اس کی کتاب آثار الصنادید میں مذکور ہے- اور اس کی تصدیق سرسید کے ایک شعر سے بھی ہوتی ہے-''

اگر یہ عبارت پیش کرنے کا یہ مقصد ہے کہ آپ اس کے کفریات کے باوجود صرف حضرت شاہ صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ سے مرید ہونے کی وجہ سے مسلمان ہو جائیں گے تو بے چارے مولوی اشرف علی تھانوی اور مولوی رشید احمد گنگوہی وغیرہ ہمانے کیا خطا کی ہے کہ ان لوگوں کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ سے مرید ہو جانے کے بعد بھی کافر اور مرتد کہا جاتا ہے-

حدیث کا صحیح محمل:

معنون حدیث کے ماتحت آپ نے سرسید پر ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے اطلاق سے روکنے والے علمائے امت کو قرآن کی اصطلاح میں مَنَّاعٌ لِلْخَیْر کا فتویٰ صادر فرما دیا ہے- میں نے آپ کے اس جواب پر بہت غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غالبًا آپ نے صرف حدیث کے ظاہری پہلو کو ملاحظہ فرمایا ہے، ورنہ جس حدیث کو آپ مدار استدلال بنانا چاہتے ہیں- اس میں آپ کے مسلک کی زبردست تردید ہے- اب بھی غور فرمائیے، بہت ممکن ہے نظر کا فریب دور ہو جائے-

''اُذْكُرُوا اَمْوَاتَكُم بِالْخَیْر'' آپ کو بھی تسلیم ہوگا کہ اس ارشاد رسالت کے مخاطبین صرف مسلمان ہیں اور محض انہی سے حضور فرما رہے ہیں کہ

''اے مسلمانو! دیکھو تم مرنے کے بعد اپنے مردوں کو برے الفاظ سے نہ یاد کرنا-''

''موتا'' کی اضافت لفظ ''کم'' کی جانب اس حقیقت کو منکشف کر رہی ہے کہ اس حکم میں صرف مسلمانوں کے مردے شامل ہیں- اب آپ ہی فیصلہ فرمائیے کہ مسلمانوں کے

مردے مسلمان ہی ہو سکتے ہیں یا کافر بھی اور اگر مسلمان اور صرف مسلمان ہو سکتے ہیں تو سرسید احمد کے بارے میں اس حدیث کو پیش کرنا بیچ بتایئے تحریف ہے یا نہیں ہے؟ اگر بالفرض وہ آپ کے نزدیک مسلمان ہے تو ان لوگوں کے مقابلے میں اس حدیث کو مدار استدلال بنانا جو اس کے کفریات کے بنا پر اس کو کافر و مرتد سمجھتے ہیں، تحریف نہیں تو کم از کم فہم وبصیرت کی توہین ضرور ہے۔ سرسید سے اتنی ہی عقیدت ہے تو پہلے آپ اس کا اسلام ثابت کیجیے اور اگر حدیث پیش کرنے کا یہ مقصد ہے کہ کسی مرنے والے کو برے الفاظ سے نہ یاد کیا جائے۔ کوئی عمل ایسا نہ اختیار کیا جائے جس میں اس کی توہین ہو تو یہ بتایئے کہ اس حکم قرآنی کا کیا مطلب ہے:

وَلا تُصَلِّ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ(۱)

''اے پیارے حبیب! آپ ان کے لیے کبھی بھی دعائے خیر نہ کیجیے اور نہ کبھی ان کے جنازے کی نماز پڑھیے اور نہ ان کی قبر پر کھڑے ہو جایئے۔ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ سرکش اور نافرمان ہو کر مرے ہیں۔''

مقام حیرت:

پانچویں جواب میں تو آپ نے بالکل کمال کر دیا ہے۔ ہمیں تو اس کو آپ کی جانب منسوب کرتے ہوئے نہایت شرم محسوس ہو رہی ہے، لیکن کیا بتاؤں ''خود کردہ را علاج نیست'' چوں کہ مجھے بھی اس مسئلے میں اطمینان کرنا ہے۔ اس لیے حق کی تلاش و تفتیش کر رہا ہوں۔

بھلا بتایئے جو شخص ''مرحوم'' اور ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے معانی کے اتحاد کا قائل ہوگا، وہ کیوں کر ان دونوں میں فرق کرے گا۔ اس کے نزدیک جو ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے اطلاق کا محل نہیں ہے، وہ ''مرحوم'' کا کیوں کر اہل ہو جائے گا۔ ہاں! البتہ ان حضرات میں سے جو سرسید پر ''رحمۃ اللہ علیہ'' کے اطلاق سے منع کرتے ہیں۔ ان کے کسی قول و فعل سے اگر آپ

(۱) توبہ:۸۴

یہ ثابت کر دیجیے کہ انہوں نے اس کو "مرحوم" کہا یا اس کو جائز بتایا ہے، جب تو آپ کا پانچواں جواب درست ہے- ورنہ یہ کوئی طلسم نہیں ہے جس کو فتح کرنے کے لیے صرف منتروں کی ضرورت پڑا کرتی ہے- آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ صرف فرضی باتوں پر دلائل کی دیواریں کھڑی نہیں ہوسکتیں، بلکہ ایسے جواب کی حقیقت ایک خیال موہوم سے بڑھ کر نہیں ہوتی، جس کو مقام استدلال میں پیش کرنا اپنی بصیرت پر دعوت ماتم دینا ہے-

جواب سادس کا جواب:

رہ گئی یہ بات کہ حضرت قبلہ عالم پیر صاحب مدظلہ کے "رحمۃ اللہ علیہ" کا استعمال سرسید احمد کو مومن اور مورد رحمت بنا دے گا تو اس کے متعلق عقیدت کی بے جا رواداری سے دور اور الگ ہٹ کر صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر بالفرض ایسا ہو بھی سکتا ہے تو صرف ان لوگوں کے لیے جو حضرت پیر صاحب کے فرمان کو وحی الٰہی مانتے ہیں اور کفر و اسلام کا معیار ان کے نزدیک صرف حضرت پیر صاحب کی نوازش اور عتاب ہے- لیکن وہ حضرات جو حق و باطل کو قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھتے ہیں، جن کے نزدیک دلائل کے مقابلے میں شخصیت کوئی چیز نہیں- ان لوگوں کے لیے یہ جواب کیوں کر تسلی بخش ہوگا؟ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت پیر صاحب کی دعائیں بارگاہ اجابت سے کبھی بھی خالی نہیں آتیں تو زیادہ سے زیادہ وہ "مستجاب الدعوات" ہوسکتے ہیں- "مجیب الدعوات" کیوں کر ان کو کہنا درست ہوسکتا ہے؟ یہ تو خاص خدا کی صفت ہے- یہ کلمہ آپ نے پیر صاحب کی عقیدت کو خوش کرنے کے لیے لکھا ہے، لیکن یاد رکھیے کہ کوئی پابند شریعت انسان آپ کی اس سعادت سے خوش نہیں ہوسکتا-

مخلصانہ درخواست:

آخر میں رخصت ہوتے ہوئے آپ سے عرض کروں گا کہ اس فتنوں کے طوفان میں دبی ہوئی فساد کی چنگاریاں نہ زندہ کیجیے- ورنہ یاد رکھیے کہ اس آتش بازی سے آپ کا اور صرف آپ کا نشیمن جل اُٹھے گا- آپ تو اپنی بربادی کا بادیدہ تر بھیانک منظر دیکھیں گے- لیکن آپ کے اغیار کے لیے آپ کی قیامت انگیز مصیبت دلچسپ تماشہ بن جائے گی- قلم

اٹھانا ہے تو حق پر قلم اٹھایئے،عقیدے کی رواداری میں آکر اہل حق کے استدلال کو کیوں بدنام کرر ہے ہیں؟ بلکہ میں تو کہوں گا اور صاف صاف کہوں گا کہ اگر آپ کو بدلنا ہے تو شوق سے بدل جایئے۔لیکن اہل سنت کے مسلمہ اصول کو آپ نہیں بدل سکتے ہیں۔خلوص و وفا کی اس تحریر پر تعصب وعناد کی عینک اتار کر کئی بار نظر فرمائیں۔اگر حق کا پہلو غالب ہو تو قبول فرمالیں۔

والسلام

ارشد قادری بلیاوی

دارالعلوم اہل سنت مصباح العلوم،قصبہ مبارک پور،اعظم گڑھ

استفسار☆

''الفقیہ'' امرتسر، مورخہ ۷ر تا ۱۴ر جون ۱۹۴۶ء میں ایک مضمون بعنوان 'مقام حیرت' من جانب جناب مولوی ارشد قادری بلیاوی صاحب نظر سے گزرا- اس مضمون میں مولوی صاحب موصوف نے جناب مولوی حامد حسن قادری صاحب، پروفیسر: سینٹ جانس کالج، آگرہ کے ایک مضمون کا جواب ارقام فرمایا ہے- جواب کے جملہ پہلو درست معلوم ہوتے ہیں- مگر ایک بات جواب میں مشکوک ہے- لہٰذا مولوی صاحب موصوف سے دلائل شرعیہ کی روشنی میں ازالۂ شکوک چاہتا ہوں-

سلسلۂ جواب میں مولوی صاحب نے حدیث شریف '' اُذکُرُوا امَوُتَاکُم بالُخَیر'' کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ حدیث اہل اسلام کے ساتھ خاص ہے- کیوں کہ اس کے مخاطب مسلمان ہیں- میری گزارش یہ ہے کہ اس حدیث کی تخصیص اہل اسلام کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں، کیوں کہ اس کے مخاطب صحابہ کرام کے اعزہ اور والدین بھی ہیں، جو اکثر و بیشتر کفر کی حالت میں مرے ہیں- قرینہ چاہتا ہے کہ حدیث مذکور کا حکم مسلم اور غیر مسلم دونوں کو عام ہے، مسلمان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ غیر مسلم کے ساتھ اس حدیث کا تعلق متصور ہوتا ہے- اس لیے کہ صحابہ کرام سے یہ بات متوقع نہیں ہوسکتی کہ مسلمان مردوں کو وہ بُرا کہتے ہوں، جس سے روکنے کی ضرورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محسوس ہوئی ہو- اس

☆ پروفیسر حامد حسن قادری، استاذ سینٹ جونس کالج آگرہ کا مضمون '' اُذکُرُوا اَمۡوَتَاکُم بالُخَیر '' اور علامہ ارشد القادری کا مضمون '' مقام حیرت '' کے تعلق سے یہ بے نام مراسلہ بعنوان '' استفسار'' ہفت روزہ '' الفقیہ'' امرتسر کے شمارہ ۲۱ر تا ۲۸ر جون ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا-

بات کی تائید صحاح ستہ کی ایک حدیث صحیح سے ہوتی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو بُرا نہ کہنے کی بات بیان فرمائی ہے- وہ یہ کہ وہ اپنی سزائے عمل کو پہنچ چکے- لہٰذا ان کو برا کہنا فضول ہے اور فضول کام سے مسلمان کو بچنا چاہیے- میری دانست میں یہ حدیث مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے مردوں کو شامل ہے اور ہر قسم کے مردے کو بلا فائدہ دینی برا کہنا منع ہے- ہاں! مسلمانوں کے اصلاح عقائد کے لیے کسی مردے کے کفریات کو ظاہر کرنا اس حدیث کی ممانعت میں داخل نہیں- اس کا مطلب یہ ہے کہ مردے کے ذاتی افعال میں سے برے افعال کو ظاہر مت کرو، کیوں کہ وہ اپنی سزائے اعمال کو پہنچ چکا- اس لیے ان کے گناہ واعمال بد کا ذکر فضول ہے اور اچھے اعمال کا ذکر بہتر ہے اور مردے کا اظہار کفر اعمال میں سے نہیں، بلکہ عقائد میں سے ہے-

لہٰذا اس حدیث سے پروفیسر موصوف کا استدلال سر سید احمد کی حمایت میں اس طرح غلط ہے کہ سر سید کے ذاتی افعال بد کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ اُس کے عقائد کفریہ کا مسلمانوں کے اصلاح خیالات کے لیے اور مولوی ارشد قادری کی جرح بھی یوں ہی غلط ہے کہ ''موتاکم'' کے مصداق مسلم اور غیر مسلم دونوں ہیں جیسا کہ مذکور ہے- اس کی تخصیص مسلمانوں کے ساتھ درست نہیں- **واللہ اعلم بالصواب**

نامہ نگار

حیرت پر حیرت☆

پروفیسر حامد حسن قادری
پروفیسر: سینٹ جانس کالج، آگرہ

''الفقیہ'' مورخہ ۷رتا۱۴ر جون میں میرے ایک مضمون کا جواب جناب ارشد قادری بلیاوی کی طرف سے بعنوان ''مقام حیرت'' شائع ہوا ہے-مگر مجھے ان کی حیرت پر حیرت ہے کہ ایک دانش مند آدمی لفظ و معنی اور جسم و روح میں فرق نہیں کرسکتا-صرف بنائے ظاہر ہے- باطن پر نظر نہیں رکھتا- میرے نزدیک ارشد صاحب کے طویل مقالے میں ضروری جواب طلب بات صرف ایک ہے، جس کو ایڈیٹر صاحب ''الفقیہ'' خود میری جانب سے لکھ سکتے تھے-اس لیے کہ میں ان کو پہلے ہی لکھ چکا تھا، مگر وہ جان کر بھول گئے یا سہو ہو گیا- میں اس غلطی کے ازالے کی خاطر یہ سطریں لکھتا ہوں-

میرے جس مضمون کا ارشد صاحب نے جواب لکھا ہے، اس کے جواب ششم میں میرے قلم سے ''مستجاب الدعوات'' کی جگہ ''مجیب الدعوات'' نکل گیا تھا، چوں کہ میں نے اپنا مسودہ ہی ''الفقیہ'' میں اشاعت کے لیے بھیج دیا تھا- میرے پاس اس کی نقل نہ تھی کہ بعد کو پڑھتا اور سہو قلم کا احساس ہوتا- چھپنے کے بعد جب دیکھا کہ ''مستجاب الدعوات'' کے محل پر میں نے ''مجیب الدعوات'' کا لفظ لکھ دیا ہے تو اسی دن میں نے ایڈیٹر صاحب الفقیہ کو یہ بات لکھ دی تھی کہ مجھے افسوس ہے کہ ''مجیب الدعوات'' کا لفظ بے محل قلم سے نکل گیا،

☆علامہ ارشد القادری کا مضمون بعنوان ''مقام حیرت'' کے جواب میں یہ مضمون ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے شمارہ ۷رتا۱۴ر جولائی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا-

دوسروں کوٹو کنے سے پہلے میں نے غلط فہمی کو رفع کرنا چاہا تھا-

جناب ارشد قادری نے اپنے مضمون ''مقام حیرت'' میں میری اس غلطی کی گرفت کی ہے- ان سے گزارش ہے کہ آپ اس کو لغزش قلم تصور فرمائیں- ایڈیٹر صاحب ''الفقیہ'' کو گواہ کے طور پر پیش کرتا ہوں، وہ اپنی شہادت وہیں حاشیے پر ثبت فرما دیتے تو مجھے اس خامہ فرسائی کی ضرورت نہ ہوتی- اس طرح کی غلطی بتقاضائے بشریت ہو جاتی ہے، جیسی کہ آپ سے بھی اسی مضمون میں سرزد ہوگئی ہے- آپ نے ''موجب رحمت'' اور ''موجب لعنت'' کے الفاظ کئی جگہ لکھے ہیں- بعض مقامات پر آپ نے ''مستوجب'' کی جگہ ''موجب'' کا لفظ تحریر فرمادیا ہے- مثلاً صفحہ ۷ر کے دوسرے کالم میں سطر ۱۲ر۱۳ر میں آپ نے لکھا ہے: ''اس کو مومن اور موجب رحمۃ اللہ علیہ ثابت کرنے کے لیے''

یہاں ''مستوجب رحمت'' موزوں و برمحل تھا- یعنی رحمۃ اللہ علیہ کا مستحق-

آپ اپنے باقی جوابات و تبصرات کے جواب میں میری طرف سے ایک خندۂ استہزا قبول فرمائیں- اگر آپ کا مسلک مسلمانوں کو کافر ثابت کرنا ہے تو یہ آپ ہی کو مبارک رہے- آپ کے نزدیک سرسید کافر، ان کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے والا کافر، ان کو کافر نہ کہنے والا کافر تو بندۂ خدا کسی کو مسلمان بھی رہنے دیجیے گا یا نہیں؟ کافر گری کی یہی گرم بازاری ہے تو مولانا حالؔی کی وہ رباعی صادق آجائے گی، جس میں وہ فرماتے ہیں:

شاید کہ قیامت میں ہو مومن سے سوال
تکفیر بھی کی تھی علما نے کہ نہیں

اگر آپ مسلمانوں کو کافر کہنے لگیں تو پھر کسی کا کافر بنایا جانا ہی تمغائے اسلام ہو جائے گا- گویا بقول سوداؔ:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی

چند روز کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک عظیم الشان جلسے (۱) میں جہاں بڑے بڑے کافر گروں کا احتجاج تھا، بعض اہل جلسہ نے مسلمانوں کے ایک بڑے لیڈر کو کافر،

(۱) یہاں ایڈیٹر ''الفقیہ'' نے یہ حاشیہ لگایا ہے: ''سنی کانفرنس بنارس مراد ہے''

ملعون، مرتد کہا- لیکن ان میں کچھ اللہ والے بھی تھے- ایک ایسے ہی صاحب نے فرمایا کہ

اس لیڈر کو کوئی کافر کہتا ہے، کوئی مرتد بتاتا ہے، کوئی ملعون ٹھہراتا ہے- لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ لیڈر "ولی اللہ" ہے- آپ لوگ اپنی رائے سے کہتے ہیں، لیکن میں قرآن وحدیث کی رُو سے کہتا ہوں اور انہوں نے یہ آیت پڑھی:

اِنّ الّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرّحْمٰنُ وُدّاً-(۱)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے- اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے-

اس لیڈر کی محبت جو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے دل میں ہے- یہ اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، ابھی وہ صاحب اسی مضمون کی حدیث شریف جو پڑھنا چاہتے تھے نہ پڑھی تھی کہ ان کا اتنا کہنا اور آیہ کریمہ کا پڑھنا ہی گویا بم کا گولہ ہو گیا کہ ارباب جلسہ میں شور برپا ہو گیا اور اُٹھ اٹھ کر جانے لگے- اس پر ایک شخص نے جلسے کے ذمہ دار اصحاب سے کہا کہ آپ حضرات اس شدید گرم موسم میں ہزاروں میل کا سفر کر کے اور صدہا روپیہ صرف کر کے جمع ہوئے ہیں، تو کس کام کے لیے؟ کیا مسلمان کو کافر بنانے کے لیے؟ آپ کا کام تو کافروں کو مسلمان بنانا ہے، نہ مسلمان کو کافر قرار دینا- وہ صاحب اس آیہ کریمہ کے بعد جو حدیث شریف سنانا چاہتے تھے، وہ یہ تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنا مقبول بنالیتا ہے تو فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ ساری دنیا میں آواز دے دو کہ ہم نے فلاں بندے کو مقبول بنالیا ہے- فرشتے سب میں پکار دیتے ہیں اور انسانوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے-"(۲)

(۱) مریم:۹۶

(۲) عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال اذا احب الله العبد نادى جبريل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس جلسے کے لوگ اس لیڈر کو کافر و مرتد کہا کریں اور سمجھا کریں- جو اس کو مسلمان اور مقبول الٰہی سمجھتا ہے، وہ ایسا ہی کہتا ہے اور کہتا رہے گا- کوئی شخص کسی کے کافر کہنے سے کافر نہیں ہوسکتا- اسی طرح سرسید رحمۃ اللہ علیہ کو جو لوگ ''رحمۃ اللہ علیہ'' کا مستحق سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہیں گے- سرسید مسلمان ہیں، سید ہیں، حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں- وہ خود اپنے آپ کو مسلمان کہتے رہے- ساری دنیا عرب و عجم، یورپ و امریکہ سرسید کو مسلمان سمجھتی اور کہتی رہی ہے-

تمام عمر میں سرسید نے کبھی بھولے سے بھی خدا اور رسول کی شان پاک میں بے ادبی نہیں کی- بلکہ نہایت ادب و احترام اور عشق و محبت ان کے صدہا اقوال و افعال سے ثابت ہے- مولانا حالیؔ کی ''حیات جاوید'' (سرسید کی سوانح عمری) پڑھیے اور خدا اور رسول کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی کے واقعات و معاملات کے واردات و جذبات پڑھیے- مومن کے کمال ایمان کی پہچان حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت و گرویدگی ہے- سرسید کا یہ عالم تھا کہ توہین کیا معنی، سوئے ادب کے ذرا سے اشارے کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے- کسی کے قول و فعل میں حضور انور کی ذات پاک کے ساتھ بے ادبی کا ادنیٰ شائبہ بھی ان کو نظر آجاتا تھا تو بے تاب ہوجاتے تھے، جوش آجاتا تھا اور فوراً زبان سے یا تحریر میں جیسا موقع ہو اس گمرہی کو رفع کرتے تھے- مجھے سرسید کے حالات و واقعات یاد ہیں، جن کی بنا پر یہ لکھ رہا ہوں- وہ باتیں لکھنے لگوں تو دفتر ہوجائے- آپ ایسی ہستی کو کافر و مرتد ٹھہراتے ہیں- یاللعجب!

درد ہر رو یکے وآں ہم کافر
پس کیست کہ درد ہر مسلماں باشد

کیا تماشا ہے- تم کہو گبر اسے گبر مسلماں اس کو

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) ان اللہ یحب فلاناً فاحببه فیحبه جبریل فینادی جبریل فی اهل السماء ان الله یحب فلاناً فأحبوه فیحبه اهل السماء ثم یوضع له القبول فی الارض-

(صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق/باب ذکر الملائکۃ/حدیث نمبر ۳۲۰۹)

پھر دیکھئے کہ کیسے کیسے برگزیدہ لوگوں نے سرسید کو سراہا ہے- حضرت مولانا مولوی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور کے ایک عظیم الشان جلسے میں سرسید کی وفات کے بعد ان کی تعریف میں فرمایا تھا کہ:

''تمام ہندوستان میں دوسو برس کی مدت میں کسی بطن مادر سے ایسا بچہ پیدا نہیں ہوا، جس کو سرسید کے مثل قرار دیا جا سکے-''

اب آپ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں کیا فتویٰ دیں گے؟ اب سرسید کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے والے کو کافر بتاتے ہیں تو مفتی صاحب قدس سرہ العزیز کے اس ارشاد کی بابت کیا رائے قائم کریں گے؟ (۱) یہ ایک مثال ہے، ایسے صدہا اقوال درج کیے جا سکتے ہیں-

جناب ارشد صاحب! خدا سے ڈریئے، اس کو منہ دکھانا اور جواب دینا ہے- اس کافر گری کی مشین کو بند کر کے رکھیے، ورنہ اس کے شکنجے میں مسلمان کو کافر بنانے والے بھی آ جائیں گے- آپ مجھ سے کیا کہتے ہیں- اپنی فکر کیجیے (۲) ؎

---

(۱) مضمون نگار کی یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ سرسید کے مذہبی عقائد و افکار کے خلاف مولانا غلام دستگیر قصوری لاہوری (ف: ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) کا رسالہ ''جواہر مضیہ رد نیچریہ'' جو ۱۳۰۴ھ/ ۸۶-۱۸۸۷ء میں مطبع گلزار محمدی لاہور سے شائع ہوا ہے، میں درجنوں اکابر علمائے لاہور، قصور، ریاست بہاول پور وغیرہ کے تائیدی دستخط کے ساتھ مفتی عبداللہ ٹونکی ثم لاہوری (ف: ۱۳۳۹ھ/ ۲۰-۱۹۲۱ء) کے بھی دستخط ہیں-

(۲) یہاں مدیر ''الفقیہ'' امرتسر نے مندرجہ ذیل حاشیہ لکھا ہے، جس میں پروفیسر حامد حسن قادری سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ''ابلاغ حق'' اور ''مقام حیرت'' از علامہ ارشد القادری میں مذکور نکات کا جواب دیں اور ثابت کریں کہ سرسید کی جانب منسوب غیر شرعی اور عقائد اسلامی سے متصادم عبارتیں اور تحریریں، ان کی نہیں ہیں اور اگر ان ہی کی ہیں تو کیا اپنے انتقال سے پہلے سرسید نے اپنی کفری عبارتوں اور منحرف خیالات سے توبہ کر لی تھی؟ کیوں کہ پروفیسر موصوف نے اپنے دونوں مضامین ''اُذْكُرُوا اَمْوَاتَكُم بِالْخَير'' اور ''حیرت پر حیرت'' میں اس اہم نکتے پر کلام نہیں کیا ہے، جو اس بحث کا مرکزی محور ہے-

> تمام مضمون میں ''ابلاغ حق'' اور ''مقام حیرت'' دو مضمون جو الفقیہ ۷/ تا ۱۴/ جون میں شائع ہو چکے ہیں، کا یہ بالکل جواب نہیں ہے- ثابت تو یہ کرنا تھا کہ یہ سرسید کی عبارتیں اور تحریریں نہیں ہیں، کیا یہ غلط ہیں؟ یا یہ ثابت کرنا تھا کہ سرسید نے مرنے سے پہلے ان سے توبہ کر لی تھی- بس جواب تھا تو یہ تھا- (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ (۱) تو

حامد حسن قادری
سینٹ جانس کالج، آگرہ

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)
امید ہے کہ پروفیسر صاحب جلد از جلد ان دونوں باتوں کا جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ (ایڈیٹر)

(۱) ''نبیڑ'' پنجابی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی نمٹنا یا نمٹانا ہیں، یہاں مذکورہ مصرعے کا مفہوم 'اپنے کام سے غرض رکھنا' ہے۔

استفسار کا تحقیقی جواب ☆

علامہ ارشد القادری

نوٹ: اپنے دار العلوم اہل سنت مصباح العلوم واقع قصبہ مبارک پور کے سالانہ امتحان کی سرگرمیوں کی بنا پر نیز اپنے برادر معظم (۱) کے سفر حج کی الوداعی مشغولیت کی وجہ سے نیز ڈاک کا سلسلہ عرصے تک بند رہنے کی وجہ سے استفسار کے جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی- لہٰذا مستفسر صاحب بالخصوص اور ناظرین ''الفقیہ'' بالعموم کی خدمت میں معذرت خواہ ہوں کہ وہ اس تاخیر کو کسی استدلالی کمزوری پر محمول نہ فرمائیں- (ارشد القادری بلیاوی، وارد آنولہ، ضلع بریلی)

میرے مضمون بعنوان ''مقام حیرت'' کے ایک گوشہ جواب پر ایک صاحب کو کچھ شبہ پیدا ہوا ہے، جس کا انہوں نے اپنے ''استفسار'' میں اظہار فرمایا ہے- اس حیثیت سے میں موصوف کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے ضمیر کی صدائے بازگشت کو منظر عام پر لا کر سنا دیا- ورنہ بسا اوقات دل کی باطنی خلش زبردست اختلاف کا موجب بن جاتی ہے-

---

☆ ایک بے نام مراسلہ بعنوان ''استفسار'' کے جواب میں تین قسطوں میں یہ تفصیلی مضمون ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے شمارے ۲۱/تا ۲۸/اگست/ ۷/تا ۱۴/ستمبر اور ۲۱/تا ۲۸/ستمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا-

(۱) مولانا شاہ غلام آسی ابن مولانا شاہ عبد اللطیف رشیدی بیک وقت علوم اسلامیہ کے جامع، صاحب حال صوفی اور شیخ طریقت تھے- ۱۹۱۷ء میں سید پورہ، بلیا، یوپی میں ولادت ہوئی، کتب درسیہ کی تکمیل اور فراغت دار العلوم منظر اسلام بریلی سے ۱۹۴۰ء میں ہوئی- جامعہ اسلامیہ ناگ پور، الجامعۃ القادریہ ہریانہ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سلسلۂ تحقیق:

رہ گیا میرا جوابی مضمون تو وہ اس وقت بھی اپنے تمام گوشوں کے ساتھ بے غبار تھا اور اب بھی حق وصداقت کے معیار پر بالکل صحیح اور درست ہے- ہاں! البتہ آپ کے وہ شبہات جو ''الفقیہ'' کے کالم میں آپ نے پیش کیے، جہاں تک میں نے غور کیا ہے، وہ سراسر غلط فہمی کی پیداوار ہیں- لیکن پھر بھی حق کو واضح کرنے کے لیے یہ میرا فریضہ ہے کہ میں اس کی مزید تشریح کردوں تاکہ آپ کا قلبی اضطراب کافور ہوجائے-

لہٰذا اس سلسلے میں میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ '' **اُذکُرُوا امَوْتَاکُم بِالْخَیر** '' کا ایجابی حکم صرف مسلمان مردوں کے ساتھ مخصوص ہے- غیر مسلموں کے لیے اس دائرۂ خیر وبرکت میں کوئی گنجائش نہیں ہے- صحاح ستہ کی جس حدیث کو آپ معیار استدلال بنانا چاہتے ہیں، وہ تحقیق کی روشنی میں سراسر آپ کے خلاف ہے- بغیر شارحین حدیث کی عرفانی رہنمائی حاصل کیے احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے صحیح محمل کو متعین کرلینا، سطحی نظر رکھنے والوں کا کام نہیں ہے- اگر عوام کو یہ جوہر نگاہ حاصل ہوجاتا تو تقلید آئمہ کا وجوب ایک مضحکہ انگیز تماشا بن کر رہ جاتا اور اس طرح سے فقہائے اسلام کی پیروی نظام شریعت کا محتاج الیہ قرار نہ پاتی- تفسیر بالرائے تو ہر شخص کے لیے آئین شریعت کا سنگین جرم ہے، چہ جائے کہ اُن کم فہم حضرات کے لیے جو اس باب میں محتاج علی المحل

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ) اور ہندوستان کے مختلف اداروں میں بحیثیت شیخ الحدیث ایک عرصے تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا- اپنے وقت کے نکتہ رس خطیب اور مناظر بھی تھے- ۱۹۴۲ء میں پہلا حج کیا اور دوسرا ۱۹۴۶ء میں، اس کے بعد بھی متعدد بار حج کی سعادت حاصل کی- ۱۹۵۲ء میں سلسلۂ چشتیہ جہانگیریہ ابوالعلائیہ کے شیخ حضرت خواجہ مخدوم محمد حسن شاہ سے بیعت ہوئے اور خلافت سے نوازے گئے- بیعت وارادت کے بعد دنیاوی علائق ترک کرکے ذکر وفکر، مجاہدہ، ریاضت، اصلاح معاشرہ اور انابت الی اللہ کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا- ۸/سال مسلسل روزے رکھے، اس کے بعد ۲۰/برس تک سال کے اکثر ایام روزے سے رہتے- ہندوستان کے مختلف خطوں میں آپ کے ہزاروں مریدین ومتوسلین ہیں- دین کی اشاعت کے لیے آپ نے درجنوں خانقاہوں، مدرسوں اور مسجدوں کی تعمیر کروائی، جن کا انتظام وانصرام آپ اپنی جیب خاص سے کرتے- ۱۳/جنوری ۲۰۰۳ء کو ۸۶/سال کی عمر میں دہلی میں آپ کا وصال ہوا اور صوبہ اتر پردیش کے قصبہ اترولہ ضلع بلرام پور میں آپ کی قائم کردہ خانقاہ اور ادارہ ''دارالتصوف'' کے احاطے میں آپ کی تدفین عمل میں آئی-

عرض کا حکم رکھتے ہیں- حدیث کا صحیح مفہوم اور مصباح نبوت کی حقیقت کو سمجھنا اس ضیا کا دوسرا نام ہے، جس کی ایمان افروز تابانیوں سے صرف آئمہ اسلام وفقہائے عظام کی سعید پیشانیاں جگمگا رہی ہیں-

کشف حقیقت:

لہٰذا صحیح بخاری کی وہ حدیث جس کو آپ نے اپنے مدعا کے اثبات میں پیش کیا ہے- تصریحات ائمہ کے مدنظر بجائے آپ کے دعوے کی تعمیر کے، شدید تخریب کرتی ہے، چوں کہ یہی حدیث آپ کے استفسار میں دلیل کی حیثیت سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے- اس لیے مناسب سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن تشریح کرلوں- اس کے بعد آپ کے استفسار کے دوسرے زاویوں پر بحث کروں گا- آپ کی پیش کردہ حدیث اصلی صورت میں ملاحظہ ہو:

> **عن عائشة رضی الله عنها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تسبوا الا موات فانهم قد افضوا الی ماقد موا-(۱)**
>
> حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم مردوں کو گالیاں نہ دو، کیوں کہ جو انہوں نے کیا تھا اپنے کرتوت کو پہنچ گئے-

ہمارے اور آپ کے درمیان جو لفظ مابہ النزاع ہے، وہ ''الاموات'' (مردے) ہے، اس کے متعلق آپ کے دعویٰ ہے کہ وہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو شامل ہے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے- آپس میں کوئی تصفیہ کن فیصلہ چاہتے ہیں تو آیئے ہم دونوں کے دونوں اپنا قضیہ فراست ایمانی رکھنے والے اُن ارباب بصیرت کے دیانت دار اجلاس میں لے چلیں جو آقائے دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ فیض وکرم سے علم وفضیلت کی سند و دستار رکھتے ہیں اور جن کی ایک جنبش نظر میں شبہات کی

(۱) صحیح بخاری: کتاب الجنائز/باب ما ینهی عن سب الاموات/حدیث نمبر ۱۳۹۳

سیکڑوں الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں- ہاں! یہ امام الشارحین حضرت علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کا دربار تحقیق و تنقیح ہے، لفظ ''الاموات'' کے متعلق محققانہ قول فیصل ملاحظہ ہو:

(قولہ الاموات) الالف واللام للعهد ای اموات المسلمین ویویده مارواه الترمذی من حدیث ابن عمر انّ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اذ کروا محاسن موتاکم وکفوا عن مساویهم واخرجه ابوداؤد ایضاً فی کتاب الادب من سننه ولا حرج فی ذکر مساوی الکفار ولا یوم بذکر محاسنهم ان کانت لهم من صدقة واعتاق و اطعام طعام و نحو ذالک-

(عینی،ص:۲۵۵،ج:۴)

''الاموات'' پر الف ولام عہد کا ہے، جس سے مراد مسلمان مردے ہیں اور اس کی تائید امام ترمذی کی وہ حدیث کرتی ہے جس کو انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے کہ اپنے مردوں کی خوبیاں بیان کرو اور ان کی برائی کرنے سے باز رہو اور امام ابوداؤد نے اپنے سنن میں کتاب الادب کے اندر تصریح فرمائی ہے کہ کافر مردوں کی برائیاں بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور نہ ان کے محاسن کے بیان کرنے کا حکم دیا جائے گا- اگر چہ اس نے اپنی زندگی میں غلام آزاد کیے ہوں، مسکینوں کو کھانا کھلائے ہوں، فقیروں پر خیرات وصدقات کیے ہوں-

تنویر بصیرت:

محترم نامہ نگار! علامہ عینی کی اس واضح عبارت کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ فرما کر بتائیے کہ '' اُذکُرُوا امَوْتَاکُم بالْخَیر'' کا ایجابی حکم اب بھی غیر مسلم مردوں کو شامل ہے؟

علاوہ ازیں امام ابوداؤد کی اس نظرافروز تصریح کے بعد کہ ''کافر مردوں کی برائی بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے'' آپ کیوں کر اس کا تصور کر سکتے ہیں کہ حدیث معنون کا مطلب وہی ہے جو آپ کی ''دانست'' میں دانستہ یا نادانستہ قیام پذیر ہے- میرے مسلک میں اگر اب بھی آپ کو کوئی خفا ہو تو دیانت کی نظر سے عبارات ذیل کا مطالعہ فرمائیے- اسی باب میں علامہ عینی کچھ پہلے ایک شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

لان الثناء بالشر علی المیت لا یسمی سبّا لانّه اما یثنی مایثنیٰ بالشر اما فی حق الفاسق او المنافق او الکافر ولیس هذا داخل فی معنی حدیث الباب-

(عینی،ص:۲۵۵)

ترجمہ: (اس لیے کہ) میت کو برائی کے ساتھ یاد کرنا یہ گالی ہی نہیں ہے-لیکن فاسق اور منافق اور کافر تو یہ لوگ (لاتسبو االاموات) کے حکم میں داخل ہی نہیں-

شارح مسلم حضرت علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی باب کے مناسب حدیث کے ماتحت آپ کی پیش کردہ حدیث کے جواب میں رقم طراز ہیں:

فالجواب ان النهی عن سب الاموات هو فی غیر المنافق وسائر الکفار و فی غیر المتظاهر بفسق او برعة اماهولاء فلایحرم ذکر هم بالشر للتحذ یرمن طریقتهم و من الا قتداء باثارهم والتخلق باخلاقهم-

(شرح مسلم امام نووی: ج ا/ص:۳۰۸،کتاب الجنائز)

سبّ اموات سے نہی خاص پرہیزگار مسلمانوں کے حق میں ہے-یعنی منافقین اور تمام کفار کے علاوہ ہے-یوں ہی جن کا فسق و بدعت مشہور ہو چکا ہے وہ بھی اس نہی سے مستثنیٰ ہیں- رہ گئی کفار و منافقین کی برائی کے ساتھ یاد تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے-اس لیے کہ اس میں

تنفیر ہے- ان کے طریقۂ بد کی پیروی اور ان کا اتباع کرنے سے-

فاضل مستفسر! خدارا انصاف سے بتایئے کہ حدیث مضمون کے متعلق تصریحات بالا کے پیش نظر آپ کا یہ فرمانا کہاں تک درست ہے کہ "میری دانست میں یہ حدیث مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے مردوں کو شامل ہے" جب کہ علامہ عینی اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہما جیسی مقتدر شخصیتوں کی نکتہ رس نظر میں یہ حدیث نہی صرف مسلمان کے ساتھ مخصوص ہے، جس کا لازمی طور پر یہ نتیجہ ہے کہ "اُذکُرُوا امَوْتَاکُم بالْخَیر" کا حکم صرف مسلمان مردوں سے متعلق ہے-

برہان کا مقام عظمت:

تصریحات ائمہ سے قطع نظر ہمارے مسلک پر خود صاحب شریعت رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کریمہ اور عمل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین شاہد عدل ہیں، جن کی زبان فیض ترجمان سے یہ جبروتی حکم نافذ ہوا ہے- خود ان کا عمل ان کے حکم کی سب سے بہترین تشریح ہے- ملاحظہ ہو:

روی الطبرانی عن کعب عن عجرۃ اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بجنازۃ فقیل ھٰذا بئس الرجل و اثنوا علیہ شرافقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تعلمون ذٰلک قالوا نعم قال وجبت و قال فی اللتی اثنوا علیھا خیراً کذالک (عینی، ص:۲۱٦)

امام طبرانی کعب بن عجرہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور پر ایک جنازہ گزرا، پس کہا گیا کہ یہ بہت بُرا شخص ہے- اس نے اپنی زندگی میں بہت بُرے کام کیے ہیں- یہ سن کر حضور نے فرمایا کہ "تم لوگ اس کو جانتے ہو؟ لوگوں نے کہا، ہاں- یہ سن کر حضور نے فرمایا جہنم واجب ہوگئی-

فاضل نامہ نگار! چشم بصیرت سے اس حدیث کے ایک ایک لفظ کا مطالعہ فرمایئے اور

انصاف سے بتائیے کہ حدیث مذکور کا ماحصل کس کے دعوے کی تائید کر رہا ہے؟

حسب ذیل نکتے اس میں قابل غور ہیں:

اولاً: حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنازہ گزرا اور صحابہ کرام نے حضور کے روبرو بجائے "**اُذکُرُوا امَوْتَاکُم بالْخَیر**" کی تعمیل کی۔ اس کی یوں مذمت بیان کی کہ یہ بہت برا اور نہایت بدکردار شخص ہے اور خود حضور نے سننے کے باوجود ان کو اس فعل سے منع بھی نہیں فرمایا۔ پس اگر حضور کے اس فرمان کا حکم عام ہوتا تو حضور صحابۂ کرام کو ضرور تنبیہ فرماتے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ اذکار بالخیر کا حکم کفار کے لیے نہیں ہے۔

ثانیاً: بلکہ خود حضور نے دریافت فرمایا کہ اس میت کی جو تم لوگ تقبیح کر رہے ہو تو اس کی برائیوں کا تمہیں علم ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں، اس سوال و جواب سے اتنا معلوم ہوا کہ غیر مسلم مردوں کی مذمت اور ان کی برائی بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ صحابۂ کرام کی سنت ہے، لیکن ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ واقعات کے انتساب میں غلط بیانی نہ ہو۔ کیوں کہ کذب کا وبال خود اپنے اوپر آجاتا ہے۔

ثالثاً: حضور نے صحابہ کرام کا یہ جواب سننے کے بعد میرے دعوے پر اور بھی مہر تصدیق ثبت فرمادی کہ اس پر جہنم کی آگ واجب ہوگئی۔ کہیے مرنے کے بعد دنیا میں کس کے لیے اس سے بڑھ کر بالشر ہوسکتا ہے کہ اس کو جہنمی کہا جائے اور وہ بھی ایسی زبان سے جو "لسان قدرت" کہہ کر پکاری جاتی ہو۔

حدیث کے اس مضمون کو مختلف اسناد و الفاظ کے ساتھ متعدد راویوں نے بیان کیا ہے۔ **کما روی المسلم فی صحیحه عن انس بن مالک و ابو داؤد فی سننه عن ابوهریرة والحاکم فی مسنده عن النفربن انس رضی الله عنهم اجمعین۔**

(باقی آئندہ)

(۲)☆

انکشاف کا حیرت انگیز نظارہ:

اب تک تو میرا نوک قلم تحقیق کے محور پر حرکت کر رہا تھا- لیکن میں آپ کے کہنے سے رفتار قلم کا رُخ آپ ہی کے مطمح نظر کی جانب پھیرتا ہوں اور بالفرض یہ تسلیم کیے لیتا ہوں کہ "**اُذکُرُوا امَوْتَاکُم بالْخَیر**" حکم مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے مردوں کو شامل ہے- یعنی اس ارشاد رسالت کا آپ کے مسلک پر یہ مطلب ہے کہ مسلم مردوں کے ساتھ ساتھ کافر مردوں کو بھی ذکر خیر سے یاد کیا جائے، لیکن محترم دوست! اس سوال کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ کافرمیت کے سرمایۂ زندگی میں خیر ہی کہاں ہے جو ان کو خیر سے یاد کرنے کا حکم دیا جائے گا- قرآن حکیم کے نصوص قطعیہ اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ کافر کے دائرہ عمل میں حسن وخوبی کا کوئی نقطہ ہی نہیں ہے، عرف شریعت میں جس کو بھی حسن وسعادت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے- وہ کفر وشرک کے نار جحیم میں جل کر بالکل بھسم ہو جاتا ہے، بحالت کفر مر جانے کی صورت میں اس کے سارے عمل حبط (اکارت) کر کے نظر انداز کر دیے جاتے ہیں- اس دعوے پر ملاحظہ ہو آیات الٰہی:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰ خِرَۃِ وَمَالَھُمْ مِنْ نّٰصِرِیْن (آل عمران:۲۲)

یہ کفر کرنے والے لوگ ہیں، جن کے تمام اعمال حبط کر لیے گئے،

☆ یہاں سے مضمون کی دوسری قسط شروع ہوئی، جو ہفت روزہ "الفقیہ" امرتسر کے شمارہ ۷/تا ۱۴/ستمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی-

دنیااورآخرت میں اوران کے لیےکوئی مددگارنہیں ہے-

أُولٰئِکَ الَّـذِيْـنَ لَيْـسَ لَهُـمْ فِي الاٰخِرَةِ اِلَّاالنَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْافِيْهَا وَبٰطِل مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْن(هود:١٦)

یہ کافر وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے جہنم کی آگ کے اور کوئی حصہ نہیں ہے اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا تمام عمل حبط کر لیے گئے اور سب ان کا کیا دھرا باطل ہو گیا-

أُولٰئِکَ الَّـذِيْـنَ كَـفَـرُوْا بِـاٰيٰـاتِ رَبِّهِـمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْناً(کہف:١٠٥)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کے ساتھ کفر کیا اور اس کی طرف لوٹنے کا انکار کیا، پس ان کے تمام اعمال حبط کر لیے گئے اور آخر میں ان کے لیے کوئی وقار نہیں قائم کیا جائے گا-

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْن(مائدہ:٦)

کفر کرنے والوں کے تمام اعمال حبط کر لیے گئے- پس وہ ٹوٹا پانے والوں میں سے ہو گئے-

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

(الاعراف:١٤٧)

وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور یوم آخرت کی طرف لوٹنے کا انکار کیا، ان کے تمام اعمال حبط کر لیے گئے-

وَمَـنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الِاسْلَامِ دِيْناًفَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَفِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْن(آل عمران:٨٥)

جس نے اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین اختیار کر لیا، اس کا کوئی عمل نہیں قبول کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ٹوٹا پانے والوں میں ہو گا-

مقامِ غور:

فاضل معترض! کتاب الٰہی کی آیات بالا پر ٹھنڈے دل سے غور فرما کر بتائیے کہ آپ کا نقطۂ نظر قرآن کی مذکورہ آیتوں سے ٹکراتا ہے یا نہیں؟ اور کافر مردوں کو ذکر خیر کے ساتھ یاد کرنے کا یہ کھلا مطلب نہیں کہ کتاب مبین کے اس ایک ایک قانون کے خلاف کیا جائے اور ان شقی روحوں کے لیے مجلس خیر آراستہ کرنے سے پہلے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ان کے کردار کی جھولیوں میں خیر و سعادت کے ذخیرے موجود ہیں، جن کو ان کے مرنے کے بعد بصورت تذکرہ تقریر کا جامہ پہنایا جارہا ہے۔ غور کیجیے! کیا قرآن بھی کافر مردوں کے بارے میں یہی فرمارہا ہے، جو آپ ان کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں؟ کیا ''حبط عمل'' اور ''خسران مبین'' کے علاوہ اس کے کوئی اور معنی آسکتے ہیں کہ سعید اور حسین الفاظ ان کے عمل و کردار کے کبھی بھی ترجمان نہیں بن سکتے۔

ایک شبہ کی تقریر اور اس کا ازالہ:

عقل کو ایک شبہ پیش کرنے کی اب بھی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ اگرچہ قرآن کریم کی اصطلاح میں کافر کے تمام اعمال حبط کر لیے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت نفس الامری سے قطع نظر کر کے صرف بے روح الفاظ ان کے لیے استعمال کریں تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ حسن صورت کا انکشاف حسن سیرت کے نظارے کو مستلزم نہیں ہے۔ ان کے بارے میں قرآن کے اس ناطق فیصلے کے باوجود یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ الفاظ کے مصداقی مفہوم سے تجرید نام کر کے صرف خالی عن المعنی الفاظ ان کی عملی سرگزشت کا عنوان بنادیا جائے۔ قرآن کریم تو اپنی آیتوں سے ان کے لیے ثواب آخرت اور رضائے الٰہی کی نفی کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا قرآن کا یہ مقصد اس صورت میں بھی بحالہ باقی رہتا ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ کتاب الٰہی کی آہنی بندشیں ایسی نہیں ہوتیں جن میں حرکت کرنے کی بھی کوئی گنجائش باقی رہ جائے۔ قرآن نے صدر دروازے کے ساتھ ساتھ یہ چور دروازہ بھی بند کردیا ہے، جس کے لیے جہان آخرت میں ذلت و رسوائی کے علاوہ کوئی حصہ ہی نہیں۔ اس کو عزت کا کوئی شکستہ لباس بھی نہیں دیا جاسکتا۔ قادر و قیوم کا قہر و غضب کبھی بھی اس کا روادار نہیں ہوسکتا کہ جہنم کے

آتشیں انگارے جن کے چہروں کو سیاہ کر چکے ہوں ان کی جبین عمل پر نقلی حسن کی بھی کوئی نمائش باقی رہ جائے- عالم برزخ میں جن منحوس روحوں کے لیے لعنت ہی لعنت ہو ان کو عزت کے بے معنی الفاظ سے بھی کیوں کر سر بلند کیا جا سکتا ہے- اس موضوع پر ارشادات الٰہی ملاحظہ ہوں:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْاوَمَاتُواْوَھُمْ کُفَّار اُولٰئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْن

جو لوگ بحالت کفر مر گئے ان پر اللہ کی لعنت ہے اور تمام فرشتوں کی لعنت ہے اور تمام لوگوں کی لعنت ہے-

اُولٰئِکَ جَزَآ ؤُھُمْ اَنَّ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃَ اللّٰہِ وَالْمَلٰئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْن (آل عمران:۸۷)

(کفر کرنے والے وہ لوگ ہیں) ان کی جزا یہ ہے کہ ان پر مرنے کے بعد اللہ کی لعنت ہے اور تمام لوگوں کی لعنت ہے-

لَاجَرَمَ اَنَّھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ ھُمُ الْخٰسِرُوْن

ضروری ہے کہ وہ لوگ آخرت میں ٹوٹا پانے والے ہیں-

فَلَمَّا جَآءَ ھُمْ مَّاعَرَفُوْا کَفَرُوْابِہ فَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْلکٰفِرِیْن
(البقرہ:۸۹)

پس جب ان کے پاس اللہ کی نشانی آئی تو اس کو نہیں پہچانا اور اس کے ساتھ کفر کیا- تو اللہ کی لعنت ہے کفر کرنے والوں پر-

اُولٰئِکَ لَھُمُ الَّلعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْءُ الدَّارِ (الرعد:۲۵)

یہ کفر کرنے والے وہ لوگ ہیں، جن کے لیے مرنے کے بعد لعنت ہے اور بہت برا گھر-

دعوت انصاف:

بحمد اللہ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتوں نے توہمات کے تمام کنگرے مسمار کر دیے- اگر

چشم بصیرت کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا جائے تو ایک منصف مزاج فہیم کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ اپنے ظلمات وہم وفریب سے نکل کر کتاب الٰہی کی ان حقیقت افروز روشنی میں طریق حق وثواب پر گامزن ہوجائے اور بہت جلد اپنی ناواقفانہ غلط روی کی ہدایت یاب تلافی کرے-قرآن کریم کی عدالت عالیہ سے اپنے خلاف فیصلہ سن کر کم از کم کسی مومن کی تو غیرت یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے باطل مسلک پر اڑا رہے اور اپنی نظر وفکر میں تبدیلی، اپنی عصمت علم کے خلاف شان تصور کرے- جہاں تک میرا خیال ہے یہ طریقہ تو ایک باطل پرست مجادل کا ہوسکتا ہے، مخلص مومن تو قرآن کریم کی بانگ ہدایت پر اپنے عظمت واقتدار کے بتوں کو بھی پاش پاش کر دیتے ہیں-

تصویر بحث کا دوسرا رُخ:

محترم نامہ نگار! اتنی تفصیل کے بعد بحث کا ایک گوشہ نامکمل ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کی بھی تکمیل کردوں تا کہ آپ کی تسکین تشنہ نہ رہ جائے- آپ نے اپنے دعوے پر دو دلیلیں پیش کی ہیں- ایک تو صحاح ستہ کی وہ حدیث ہے، جس کا میں نے نہایت بسط کے ساتھ محدثین کی زبان وقلم سے صحیح محمل متعین کر کے جواب دے دیا ہے اور میرے خیال میں آپ کے لیے اس سے بہتر اور کوئی شافی جواب نہیں ہوسکتا- ایک طرف آپ کی اپنی دانست کا سرمایہ ہے اور دوسری جانب اُن عناصر ملت کا عرفانی خزانہ ہے جن کے آسمانی ٹکڑوں سے اقلیم فہم وبصیرت کے بڑے بڑے تاجدار پل چکے ہیں اور آج بھی اسی بادۂ کہن کے بچے بچائے تلچھٹ میں انہی میکشان فہم وفراست کی سرمستیوں کا خمار ہے، جس کا ایک گھونٹ حلق سے اترتے ہی دلوں میں بلا کا سرور اور آنکھوں میں کشف ومعرفت کا نور بھر دیتا ہے- اب اس کا فیصلہ کہ طرفین میں سے کس کی دانست کی پیداوار قابل ترجیح اور سزاوار اخذ واستناد ہے تو میں اس کو نہایت فراخدلی کے ساتھ ناظرین ''الفقیہ'' کے انصاف کیش نظر اور آپ کے دیانت پسند قلب کے سپرد کرتا ہوں-

آپ کی دوسری دلیل یہ ہے:

''قرینہ چاہتا ہے کہ حدیث مذکور کا حکم مسلم اور غیر مسلم دونوں کو عام

ہے، مسلمان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ غیر مسلم کے ساتھ اس حدیث
کا تعلق متصور ہوتا ہے- اس لیے کہ صحابہ کرام سے یہ بات متوقع نہیں
ہوسکتی کہ مسلمان مردوں کو وہ بُرا کہتے ہوں، جس سے روکنے کی
ضرورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محسوس ہوئی ہو-'' (الفقیہ)

آپ کی یہ دلیل تین وجہوں سے قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کو دلیل کی حیثیت بھی دی جا سکے- بلکہ معرکۂ تحقیقات میں آنے کے بعد جارحانہ حملہ تو بڑی چیز ہے، دفاع کی طاقت بھی اس میں باقی نہیں رہتی-

(باقی آئندہ)

(۳)☆

اگر یہ بات ہے تو آپ کیا فرماتے ہیں اُن تمام منہیات کے بارے میں، جن سے اسلام نے صحابہ کرام کو روکا ہے، اگر مسلمان مردوں کو بُرا کہنے کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی تو ان اعمال ممنوعہ شنیعہ کے کرنے کی کیوں کر امید کی جاسکے گی؟ لہٰذا آپ کے اصول پر تمام ممنوعات شرعیہ کے مخاطب صرف کفار ہیں اور ہاں، تو ان احکام ممنوعہ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے، جن کا تعلق انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بھی ہے؟ کیا ان کی عصمت نبوت کے ساتھ ساتھ آپ محل نہیں؟ صحیح کرنے کے لیے ان افعال قبیحہ سے آلودہ ہونے کی توقع ان سے کرسکیں گے اور اگر توقع سے مراد امکان ذاتی ہے تو صحابہ کرام کو اس سے متصف ماننے میں کوئی ہرج نہیں ہے- بلکہ صحابۂ کرام سے تو امکان عادی کا بھی تعلق ہے اور اگر توقع کا مطلب ارادۂ بد کا دھندلا سا انکشاف ہے تو اس کا ثبوت آپ کے ذمہ ہے کہ جب تک توقع کسی کے ساتھ قائم نہ ہو جائے احکام الٰہیہ اس کی جانب متوجہ نہیں ہوں گے-

بطلان کی دوسری وجہ:

آپ کی دلیل پر دوسری جرح یہ ہے کہ استدلال میں تقریب تام نہیں ہے- یعنی دلیل دعوے کے مطابق نہیں ہے- آپ کا دعویٰ تو یہ ہے کہ:

''حدیث مذکور کا حکم مسلم اور غیر مسلم دونوں کو عام ہے''

اور دلیل یہ ہے کہ

☆ یہاں سے مضمون کی تیسری اور آخری قسط شروع ہوئی، جو ہفت روزہ ''الفقیہ'' امرتسر کے شمارہ ۲۱ ؍تا ۲۸ ؍ستمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی-

''صحابۂ کرام سے یہ بات متوقع نہیں ہوسکتی کہ مسلمان مردوں کو وہ بُرا کہتے ہوں، جس سے روکنے کی ضرورت رسول اللہ علیہ وسلم کو محسوس ہوئی ہو۔''

غور فرمایئے! آپ کی یہ دلیل اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ حدیث مذکور یعنی حدیث نہی کا حکم غیر مسلم مردوں کے ساتھ خاص ہے، کیوں کہ مسلم مردوں کو بھی اگر اس میں شریک کیا جائے تو اس کا ظاہر مطلب یہ ہوگا کہ پہلے صحابۂ کرام سے مسلم مردوں کو بُرا کہنے کی توقع تسلیم کرلی جائے۔ اس کے بعد یہ فرمان رسالت ان کی جانب متوجہ ہو، کیوں کہ آپ کے مسلک پر صحابۂ کرام کو بغیر توقع کے مسلمان مردوں کو برا کہنے سے روکنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں اور اس سے پہلے آپ صحابۂ کرام سے توقع کی نفی کرچکے ہیں۔ ہاں! البتہ مسلم مردوں کے متعلق توقع کی نفی کے بعد کافر مردوں کو برا کہنے کا احتمال باقی رہ جاتا ہے۔ لہٰذا اب حکم مذکور کا تعلق انہی کے ساتھ خاص ہوگا۔ جیسا کہ آپ نے اس سے پہلے اس نکتے کی جانب ایک جگہ اشارہ بھی کیا ہے'' بلکہ غیر مسلم کے ساتھ اس حدیث کا تعلق متصور ہوتا ہے۔''

مسلم مردوں کے ساتھ اس حدیث کی تخصیص آپ کو گوارا نہ تھی۔ لیکن بجائے عموم کے (اگرچہ یہ بھی قطعاً درست نہیں ہے) کافر مردوں کے ساتھ خاص کردیا۔ **فرمن المطر وقام تحت المیزاب۔**

بطلان کی تیسری وجہ:

غالبًا اصول فقہ کا یہ قانون آپ کو معلوم ہوگا کہ فرعی احکام کے مخاطب صرف مومن بندے ہوتے ہیں اور ایسے احکام کا تعلق صرف انہی سے ہوتا ہے۔'' **اُذکُرُوا اَمَوٰتَاکُم بالْخَیر** '' یہ شریعت اسلامیہ کا کوئی اصولی مسئلہ نہیں ہے، جس کے مخاطب غیر مسلم بھی ہوں۔ لہٰذا اس صیغۂ فرمان کا تخاطب صرف مسلمانوں سے ہے۔ جس کا یہ مطلب ہوا کہ اے مسلمانو! تم اپنے مردوں کو بھلائی کے ساتھ یاد کرو۔'' اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار میں اپنے گزشتہ مضمون میں بھی کرچکا ہوں کہ آیا مسلمانوں کے مردے صرف

مسلمان ہی ہیں یا کافر بھی؟ تو اس کے متعلق اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں اپنے ہونے اور غیر ہونے کا مدار سلسلہ نسب پر نہیں ہے، بلکہ اشتراک ملت پر ہے- اگر زندگی میں ملت الٰہیہ دو شخصوں میں مشترک ہے تو ان کے مابین نسبت اتحاد حیات دنیاوی میں بھی ہے اور عالم برزخ میں بھی اور اگر ملت الٰہیہ کا اشتراک نہیں ہے تو سلسلہ نسب میں متحد ہونے کے باوجود ان کے درمیان واجب الانقطاع مغائرت ہے، جس کا سلسلہ دنیاوی زندگی سے لے کر اُخروی حیات تک دراز ہے اور اس اصولی مغائرت کے بعد کوئی رشتہ ایسا نہیں جو ان دو متغائرین کو متحد کر سکے- میرے اس دعوے پر حضرت نوح علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیٹے کا واقعہ شاہد عدل ہے، جس کی قرآن کریم نے اپنی زبان میں ترجمانی فرمائی ہے-

وَنَادٰی نُوْح رَّبَّه فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْنَ قَالَ یَا نُوْحُ اِنَّه لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ اِنَّه عَمَل غَیْرُ صَالح (ہود:۴۵)

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا، عرض کی اے میرے رب! میرا بیٹا بھی تو میرے گھر والا ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حکم والا ہے، فرمایا اے نوح! وہ تیرے اہل سے نہیں، بے شک اس کے عمل بہت برے ہیں-

محترم دوست! بنظر انصاف دیکھئے کہ یہ آیات الٰہی اسی بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ کفر و ایمان میں کوئی رشتہ اتحاد متصور نہیں ہوسکتا- یونہی ایک مومن اور کافر کے اندر سلسلۂ نسب کے باوجود کوئی ربط یگانگت قائم نہیں ہوسکتا- لہٰذا ایک کافر جب دنیاوی زندگی میں مومن کا اپنا نہیں ہے تو مرنے کے بعد عالم برزخ میں وہ کیوں کر اس کا اپنا ہوجائے گا؟ پس اس تقریر سے ثابت ہوا کہ '' اُذکُرُوا اَمْوَاتَکُم بالْخَیر ''میں مسلمانوں کے اپنے مردوں سے مراد صرف مومن مردے ہوسکتے ہیں- کافر مردوں کو اس میں شریک کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے- لہٰذا بقول آپ کے کافر مردوں کو بھی اگر اس حکم میں شریک کرلیا جائے تو 'موتاکم' (تمہارے مردے) کی اضافت کی تخصیص باطل ہوجاتی ہے، جو منشاء کلام کے

سراسر خلاف ہے- بالخصوص اس صورت میں جب کہ آپ کی وہ قرینہ والی دلیل حدیث مذکور کے حکم کو کافر مردوں کے ساتھ خاص کر دیتی ہے- (جیسا کہ اس پر مفصل بحث سابق میں گزر چکی-) لہٰذا ایسی مشکل میں متکلم کے کلام کا مقصد بالکل فوت ہو جاتا ہے-

تحقیق کی دوسری جہت:

اور اگر صحابۂ عظام کے ''اپنے مردے'' سے مراد ان کے رشتہ دار ہیں، خواہ وہ کافر ہوں یا مسلم تو قرآن مجید اور کتب تاریخ وسیر کی ان تصریحات کا آپ کے پاس کیا جواب ہے، جن سے گزرے ہوئے اوباشوں اور بدکرداروں کے فواحش وسیہ کاری کا مرقع سامنے آجاتا ہے اور جو اس بات پر یقینی طور پر دلالت کرتے تھے، جو خود ان کے مرے ہوئے رشتہ داروں سے متعلق تھے اور جن سے مقصود تحصیل عبرت وبصیرت، تحدیث نعمت اسلام اور تجہیل مراسم شرک وکفر تھا اور حقیقت واقعی بھی یہی ہے کہ اگر صحابۂ کرام ان واقعات کی پیہم اور مسلسل روایتیں آپس میں نہ کریں تو ہم تک ان کے پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا-

علاوہ ازیں حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کفار ومشرکین ودشمنان رسول سے متعلق ہجو بہت مشہور ہے- کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جواب کی نوعیت کی اقتضا کے اعتبار سے درمیان ہجو میں سلسلۂ نسب کی بھی مذمت کرنی پڑتی تھی- چنانچہ حضور کی خدمت میں جب انہوں نے ایک دن دشمنان نبی اور گستاخان رسول کے سلسلہ نسب پر ہجو کہنے کا خیال ظاہر کیا تو حضور نے فرمایا کہ حسان! تم اس خاندان کی کیوں کر ہجو کر سکتے ہو جس سے میرا بھی سلسلۂ نسب متعلق ہے؟ یہ سن کر انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ فرمائیں، میں تو آپ کو ان میں سے اس طرح صفائی کے ساتھ الگ کرلوں گا جیسے آٹے میں سے بال الگ کرلیا جاتا ہے- اس کے بعد حضور کی معنی خیز خاموشی نے انہیں اس بات کی لطیف اجازت مرحمت فرما دی-

معزز نامہ نگار! غور فرمائیے کہ سلسلۂ نسب کی ہجو کرنے کا اس کے علاوہ اور کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ ارباب خاندان اور اصحاب نسب کی مذمت کی جائے جن میں مرے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور زندہ بھی-

اب آپ ہی بتائیے کہ اگر اپنے مردے سے مراد رشتہ دار ہوتے تو صحابۂ کرام حتیٰ کہ خود حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کافر مردہ رسمی رشتہ داروں کی مذمت کیوں کر گوارا فرما لیتے اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فعل کی تحسین فرماتے ہوئے اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُس (اے اللہ جبریل کی روحانی طاقت سے حسان کی امداد فرما) کے محبت آفریں جملے سے ان کی کامرانی کیوں طلب فرماتے؟

لمحۂ واپسیں:

مجھے یقین ہے کہ حدیث معنون پر ایسی واضح اور بسیط تحقیقات کے بعد اب مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی- دیانت دار فرد کے لیے اتنا بہت کافی ہے اور عناد پرور شخص کے لیے اس سے بھی بہت زیادہ ناکافی -اسی حقیقت کی بنیاد پر حق و دیانت کی ان چند سطروں کو دیکھ کر زبان انصاف کو یہ کہنا پڑے گا کہ پروفیسر مولوی حامد حسن صاحب کے مضمون پر میری جرح بالکل صحیح اور درست ہے اور اس میں کسی قسم کے ضعف کا شائبہ تک نہیں ہے-

فاضل محترم! کاش یہ میری تحقیقاتی کاوش سودمند ہوتی اور آپ کی قلبی خلش دور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جاتا- ہاں! اتنی تفصیل کے بعد آپ کے لیے اب بھی استفسار کا دروازہ کشادہ ہے، نہایت آزادی کے ساتھ ہر وقت اپنے حق کو استعمال فرما سکتے ہیں ؎

یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج طلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے امن ساحل ڈھونڈھنے والے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیم وَ تُبْ عَلَینَا اِنَّکَ اَنْتَ التَوّابُ الرَّحیم-

کتابیات

مقدمہ اور حواشی میں مندرجہ ذیل کتابوں اور رسائل سے براہ راست استفادہ کیا گیا

(۱) آثارالصنادید: سرسید احمد خاں (مرتبہ خلیق انجم) قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی،۲۰۰۳ء

(۲) آثار سرسید: ضیاء الدین لاہوری، جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۷ء

(۳) ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی: خوشتر نورانی، مکتبہ جام نور دہلی،۲۰۰۷ء

(۴) الجامع الصغیر: عبدالرحمٰن بن ابی بکر جلال الدین سیوطی

(۵) الفقیہ (ہفت روزہ) امرتسر

(۶) المستدرک علی الصحیحین: محمد بن عبداللہ حاکم نیساپوری، دارالحرمین للطباعۃ قاہرہ،۱۹۹۷ء

(۷) امداد الافاق برجم اہل النفاق: ڈپٹی امداد العلی، مطبع نظامی کان پور،۱۸۷۳ء

(۸) باقیات حامد حسن قادری: اورنگ زیب نیازی، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور،۲۰۰۶ء

(۹) صحیح بخاری: محمد بن اسماعیل بخاری

(۱۰) تحریک پاکستان اور علمائے کرام: محمد صادق قصوری، مکتبہ زاویہ لاہور،۱۹۹۹ء

(۱۱) تقاریظ امام احمد رضا: سید صابر حسین بخاری، اکبر بک سیلرز لاہور،۲۰۱۳ء

(۱۲) تذکرۂ علمائے ہند: رحمٰن علی، مرتبہ: ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی،۱۹۶۱ء

(۱۳) جام نور (ماہنامہ) دہلی: جلد:۵، شمارہ: مارچ ۲۰۰۳ء

(۱۴) جام نور (ماہنامہ) دہلی، رئیس القلم نمبر: جلد:۱، شمارہ: جون تا اگست ۲۰۰۲ء

(۱۵) جامع ترمذی: ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی

(۱۶) جواہر مضیّہ ردنیچریہ: غلام دستگیر قصوری، مطبع گلزار محمدی لاہور،۸۶/۱۸۸۷ء

(۱۷) جہان امیر ملت: محمد صادق قصوری، مرکزی مجلس امیر ملت پاکستان،۱۹۹۹ء

(۱۸) حدائق الحنفیہ: فقیر محمد جہلمی، نول کشور لکھنؤ،۱۸۸۶ء

(۱۹) حضرت امیر ملت اور تحریک پاکستان: صادق قصوری، مرکزی مجلس جماعتیہ پاکستان،۱۹۹۴ء
(۲۰) حیات جاوید: الطاف حسین حالی، نامی پریس کانپور،۱۹۰۱ء
(۲۱) حیات سرسید (خودنوشت سوانح): ضیاء الدین لاہوری، جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۳ء
(۲۲) حیات شبلی: سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ،۲۰۰۸ء
(۲۳) رودکوثر: شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا دہلی، سنہ ندارد
(۲۴) سرسید اوران کی تحریک: ضیاء الدین لاہوری، جمعیۃ پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء
(۲۵) سنن ابی داؤد: ابوداؤد سلیمان بن الاشعث الازدی السجستانی
(۲۶) سوغات رضا: مرتبہ محمد سعید نوری، رضا اکیڈمی ممبئی، ۱۹۹۸ء
(۲۷) سیرت امیر ملت: سید اختر حسین شاہ، امیر ملت پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۹ء
(۲۸) قرآن کریم
(۲۹) گل رعنا: حکیم سید عبدالحی لکھنوی، مجلس تحقیقات ونشریات لکھنؤ، سنہ ندارد
(۳۰) مجمع الزوائد: ابوالحسن نورالدین علی بن ابوبکر بن سلیمان الہیثمی (۸۰۷ھ) **دارالریان للتراث** قاہرہ، ۱۴۰۷ھ
(۳۱) مسلم: مسلم بن الحجاج القشیری
(۳۲) موج کوثر: شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا دہلی، سنہ ندارد
(۳۳) مولانا حامد حسن قادری: سوانح حیات اور ادبی کارنامے: (مقالہ پی ایچ ڈی) سید نور محمد سرور سندھ یونیورسٹی پاکستان، ۱۹۷۸ء
(۳۴) نصرۃ الابرار: مفتی محمد لدھیانوی، مطبع صحافی لاہور، ۱۸۸۸ء

مرتب کتاب کی دیگر مطبوعات

- مشارق الانوار (ترتیب وتصحیح)
- قلم کی جسارت (اداریوں کا مجموعہ)
- دورجدید کے بعض مسلم مسائل: ایک بازدید (مضامین کا مجموعہ)
- روبرو (سوسے زائد شخصیات کے انٹرویوز کا مجموعہ) (۳ر جلدیں)
- تین علمی وفکری انٹرویوز (تین موضوعات پر برصغیر کے مکاتب فکر کے نمائندوں سے گفتگو)
- ارشد کی کہانی ارشد کی زبانی
- Islam,Jihad & Terrorism
- علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات
- فغان درویش (علامہ ارشدالقادری کے اداریے)
- سرسید کے مذہبی عقائدوافکار: ایک مکالمہ
- سیداحمد رائے بریلوی، تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ (زیرتصنیف)

Address of author:
Jaam-e-Noor
422, Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi-6
website: www.khushtarnoorani.in
email: k_noorani@yahoo.com
Phone: 011-23281418

عصری معیار کے مطابق اسلامی ادب کا اشاعتی مرکز

ادارۂ فکر اسلامی، دھلی

کی اہم مطبوعات

علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

از: خوشتر نورانی، صفحات: 208 قیمت:/130

ماہنامہ جام نور کے علمی و فکری انٹرویوز کا مجموعہ

روبرو (۳ جلدیں)

از: خوشتر نورانی، صفحات: 976 قیمت:/440

علامہ ارشد القادری کے اداریوں کا مجموعہ

فغان درویش

ترتیب: خوشتر نورانی صفحات: 136 قیمت:/60

ماہنامہ جام نور کا ایک یادگار تنقیدی، علمی و ادبی کالم

خامہ تلاشی

از: ابوالفیض معینی، صفحات: 200 قیمت:/60

امام زہری: ایک عظیم محدث

از: منظر الاسلام ازہری، صفحات: 76 قیمت:/40

Islam,Jihad and Terrorism

By:KhushtarNoorani

Pages:395,Price:Rs;180/

دور جدید کے بعض مسلم مسائل

ایک بازدید

از: خوشتر نورانی، صفحات: 156 قیمت:/60

جہاد، دہشت گردی، اجتہاد و تقلید، انقلاب ۱۸۵۷ء

تین علمی و فکری انٹرویوز

از: خوشتر نورانی، صفحات: 88 قیمت:/40

قاضی ابو یوسف: حیات اور علمی کارنامے

از: شیخ زاہد کوثری

ترجمہ: منظر الاسلام ازہری، قیمت:/100

تحقیق و تفہیم

از: اسید الحق قادری، ص: 276 قیمت:/150

ایک اہم تاریخی حقیقت کو بے نقاب کرتی علمی و تحقیقی کتاب

سید احمد رائے بریلوی، تحریک جہاد اور برٹش گورنمنٹ

از: مولانا خوشتر نورانی

جلد ہی منظر عام پر آ رہی ہے

تقسیم کار

Maktaba Jaam-e-Noor

422,Matia Mahal,Jama Masjid,Delhi-6

Phone:011-23281418,Mob:09136492496,email:kausar18@yahoo.com